فہرست مضامین معارف القرآن جلد سوم

مضامین	صفحہ
سورۂ مائدہ	۹
شانِ نزول اور خلاصہ مضامین سورۃ	۹
اسلام میں عقود و معاملات کی اہمیت	۱۱
بہیمۃ الانعام کی تفصیل اور اس سے مستثنیٰ جانور	۱۳
شعائر اللہ کا مفہوم اور ان کا احترام	۱۵
باہمی تعاون و تناصر کا قرآنی اصول	۲۰
قومیتوں کی تقسیم	۲۲
قومیت اور اجتماعیت کیلئے قرآنی تعلیم	۲۳
حلال و حرام جانوروں کی تفصیل	۲۶
عید اور تہوار منانے کے اسلامی اصول	۳۲
اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت کا بیان	۳۶
بقیہ حلال و حرام جانوروں کا بیان	۳۹
طیبات اور خبائث کی شرعی حقیقت	۴۲
صرف نام کے یہودی و نصرانی جو حقیقۃً کسی مذہب کے قائل نہیں ہر تو وہ اہل کتاب میں داخل نہیں	۴۸
طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟	۴۹
اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہونے کی حکمت اور درجہ	۵۱
خلاصۂ کلام	۵۶
کن عورتوں سے نکاح حلال ہے؟ اور محصنات کی تفصیل	۶۰
احکامِ شرعیہ متعلقہ عبادات	۶۵
سچی گواہی کا بیان اور شہادت کی تفصیل	۶۸
امتحانات کے نمبر، سند اور سرٹیفکٹ اور انتخابات کے ووٹ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں	۷۰
امتِ محمدیہ پر حق تعالیٰ کے خصوصی انعامات	۷۴
وہ عہد و میثاق جو بنی اسرائیل سے لیا گیا اسکی تفصیل	۷۸
بنی اسرائیل کا نقضِ عہد اور اس پر حق تعالیٰ کا غضب	۸۱
عیسائی فرقوں میں باہمی عداوت	۸۴
تردید قولِ نصاریٰ	۸۷

مضامین	صفحہ
زمانۂ فترت کی تحقیق	۹۰
زمانۂ فترت کے احکام	۹۱
ایک سوال اور جواب	″
خاتم الانبیاءؐ کے مخصوص کمالات کی طرف اشارہ	″
قوم موسیٰؑ پر خصوصی انعامات	۹۴
ارضِ مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے	۹۸
قوم کی انتہائی بے وفائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتہائی عزم و استقلال	۱۰۳
وادیٔ تیہ	۱۰۵
قصۂ ہابیل و قابیل	۱۱۰
تاریخی روایات کی نقل میں احتیاط اور سچائی واجب ہے	۱۱۱
قبولیتِ عمل کا مدار اخلاصِ تقویٰ پر ہے	۱۱۳
جرم و سزا کے چند قرآنی ضابطے	۱۱۴
قرآنی قوانین کا عجیب و غریب انقلابی اسلوب	۱۱۵
شرعی سزاؤں کی تین قسمیں اور ان کی تفصیل	۱۱۶
وسیلہ کی تفسیر	۱۲۶
سرقہ کی تعریف اور اس کی تفصیل	۱۲۹
اسلامی سزاؤں پر اعتراضات کا جواب	۱۳۳
رسوم جاہلیت کا مٹانا اور اسلامی مساوات کا قیام	۱۳۷
اس پر کفار کے طعنے اور ان کا جواب از آیت ۴۱ تا ۴۳	″
اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مقدمات کا ضابطہ	۱۴۶
یہود کی ایک بری خصلت	۱۴۸
عوام کیلئے علماء کے اتباع کا ضابطہ	″
یہود کی ایک دوسری بری خصلت	۱۵۰
تیسری بری خصلت، کتاب اللہ کی تحریف	″
چوتھی بری خصلت، رشوت خوری	۱۵۱
تورات کے کتاب الٰہی ہونے کا بیان	۱۵۲
قرآن تورات و انجیل کا بھی محافظ ہے	۱۶۲
شرائع انبیاء میں جزوی اختلاف اور اس کی حکمت	۱۶۳
چند احکام	۱۶۴

مضمون	صفحہ
آیت ۵۱ تا ۵۸ مع خلاصۂ تفسیر	۱۶۵
شانِ نزول کا واقعہ یہود کی عہد شکنی اور اہل مکہ سے سازش	۱۷۰
وفاتِ نبویؐ کے بعد فتنۂ ارتداد، صدیقِ اکبرؓ کا جہاد،	۱۷۵
مسیلمۂ کذاب اور اسود عنسی کا خاتمہ	〃
آیت ۵۹ تا ۶۱ مع خلاصۂ تفسیر	۱۸۱
تبلیغ و دعوت میں مخاطب کے نفسیات کی رعایت	۱۸۳
آیت ۶۲، ۶۳ مع خلاصۂ تفسیر	〃
یہود کی اخلاقی تباہ حالی	۱۸۴
اصلاح اعمال کا طریقہ	〃
علماء پر عوام کے اعمال کی ذمہ داری	۱۸۵
علماء و مشائخ کے لئے تنبیہ	〃
اصلاح امت کا طریقہ	۱۸۷
گناہوں پر اظہارِ نفرت نہ کرنے پر وعید	۱۸۸
آیت ۶۴ تا ۶۷ مع خلاصۂ تفسیر	۱۸۹
یہود کی ایک گستاخی کا جواب	۱۹۱
احکام الٰہیہ پر پورا عمل دنیا میں برکات کا سبب ہے	۱۹۲
احکام الٰہیہ پر پورا عمل کس طرح ہوتا ہے	〃
ایک شبہ کا جواب	۱۹۳
تبلیغ و دعوت کی تاکید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی	۱۹۴
حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ کی ایک نصیحت	〃
آیت ۶۸، ۶۹ مع خلاصۂ تفسیر	۱۹۵
اہل کتاب کو شریعتِ الٰہیہ کے اتباع کی ہدایت	۱۹۷
حدیثِ رسولؐ بھی قرآن کیطرح واجب الاتباع ہے	〃
احکامِ شرعیہ کی تین قسمیں	۱۹۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تسلی	۱۹۹
چار اقوام کو ایمان کی دعوت اور عمل صالح کی ترغیب اور نجاتِ آخرت کا ضابطہ	〃
اللہ کے نزدیک اعزاز و امتیاز کا مدار عملِ صالح پر ہے	۲۰۰
ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر اور ایمان بالرسولؐ	〃
کے بغیر کسی کی نجات (ایک شبہ کا جواب)	
آیت ۷۰، ۷۱ مع خلاصۂ تفسیر	۲۰۳
بنی اسرائیل کی عہد شکنی	۲۰۴
آیت ۷۲ تا ۷۷ مع خلاصۂ تفسیر	۲۰۵

مضمون	صفحہ
حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی تردید	۲۰۷
حضرت مریمؑ نبی تھیں یا ولی	۲۰۸
آیت ۷۸ تا ۸۱ مع خلاصۂ تفسیر	〃
بنی اسرائیل کی کجروی کا ایک دوسرا پہلو	۲۱۰
بنی اسرائیل کی افراط و تفریط	۲۱۱
اللہ تعالیٰ تک رسائی کا طریقہ	۲۱۱
غلو ممنوع ہے، مگر علمی تحقیق و تدقیق اس میں داخل نہیں	۲۱۲
بنی اسرائیل کو معتدل راہ کی ہدایت	〃
بنی اسرائیل کے غلو کا انجام بد	۲۱۳
آیت ۸۲ تا ۸۶، ابتداء پارۂ ہفتم مع خلاصۂ تفسیر	〃
بعض اہل کتاب کی حق پرستی	۲۱۶
شاہ حبشہ کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر	۲۱۷
اور بادشاہِ حبشہ پر اس کا اثر،	
شاہِ حبشہ کا وفد بارگاہِ رسالتؐ میں،	۲۱۷
قوم و ملت کی اصلی روح حق پرست علماء و مشائخ ہیں	۲۱۸
آیت ۸۷، ۸۸ مع خلاصۂ تفسیر	۲۱۹
ترکِ دنیا حدودِ شرعیہ کے اندر ہو تو محمود ورنہ حرام ہے	۲۲۰
کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجات	〃
آیت ۸۹ مع خلاصۂ تفسیر	۲۲۱
قسم کھانے کی چند صورتیں اور ان کے متعلق احکام	۲۲۲
قسم ٹوٹنے سے پہلے کفارہ کی ادائیگی معتبر نہیں	۲۲۴
آیت ۹۰ تا ۹۲ مع خلاصۂ تفسیر	۲۲۵
تمام کائنات کی تخلیق انسان کے نفع کے لئے ہے،	۲۲۶
ازلام کی تشریح	〃
قرعہ اندازی کی جائز صورت	۲۲۷
شراب و جوئے کے جسمانی اور روحانی مفاسد	۲۲۷
آیت ۹۳ تا ۹۶ مع خلاصۂ تفسیر	۲۳۰
حرم میں شکار کی ممانعت اور متعلقہ مسائل	۲۳۳
آیت ۹۷ تا ۱۰۰ مع خلاصۂ تفسیر	۲۳۵
امن و اطمینان کے چار ذرائع	۲۳۷
بیت اللہ پورے عالم کا عمود ہے	〃
امن عالم بیت اللہ کے وجود سے وابستہ ہے	۲۳۸
خبیث اور طیب کی تشریح	۲۴۱
آیت کا شانِ نزول	۲۴۲
آیت ۱۰۱ تا ۱۰۳ مع خلاصۂ تفسیر	۲۴۳
بے ضرورت سوال کرنے کی ممانعت	۲۴۵
شانِ نزول	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم ہے	〃
بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تشریح	۲۴۶

مضمون	صفحہ
آیت ۱۰۴، ۱۰۵ مع خلاصۂ تفسیر	۲۴۷
آیات کا شانِ نزول	۲۴۸
نااہل کو مقتدا بنانا ہلاکت کو دعوت دینا ہے	۲۴۹
اقتدار کا معیار	۲۵۰
کسی پر تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ	〃
اصلاحِ خلق کی فکر کرنیوالوں کو ایک تسلی	〃
گناہوں کی روک تھام کے بارے میں صدیق اکبرؓ کا خطبہ	۲۵۱
معروف اور منکر کے معنے	〃
ائمۂ مجتہدین کے مختلف اقوال میں سے کوئی بھی	۲۵۲
منکرِ شرعی نہیں ہوتا	
آیات ۱۰۶ تا ۱۰۸ مع خلاصۂ تفسیر	۲۵۳
آیت کا شانِ نزول	۲۵۴
وصیت اور وصی کے بعض احکام	۲۵۷
کافر کے مقابلہ میں کافر کی گواہی مقبول ہے	۲۵۸
جس شخص کے ذمہ کسی کا حق ہو وہ اس کو قید کرا سکتا ہے	〃
آیت ۱۰۹، ۱۱۰ مع خلاصۂ تفسیر	۲۵۹
قیامت میں سب سے پہلے سوال انبیاء علیہم السلام سے ہوگا	۲۶۱
ایک شبہ کا جواب	〃
انبیاء کی انتہائی شفقت، ایک سوال و جواب	۲۶۳
محشر میں پانچ چیزوں کا سوال	〃
حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خصوصی سوال و جواب	۲۶۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب	۲۶۵
حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چند خصوصی انعامات	〃
آیت ۱۱۱ تا ۱۱۵ مع خلاصۂ تفسیر	۲۶۶
مومن کو نبی سے معجزہ کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے	۲۶۸
جب نعمت غیر معمولی بڑی ہو تو ناشکری کا	〃
وبال بھی بڑا ہوتا ہے	
آیت ۱۱۶ تا ۱۱۸ مع خلاصۂ تفسیر	۲۶۹
فوائد مہمہ	۲۷۱
آیت ۱۱۹، ۱۲۰ مع خلاصۂ تفسیر	۲۷۳
ختم سورۂ مائدہ	۲۷۴

سُورَةُ الْأَنْعَام

مضمون	صفحہ
آیت ۱ تا ۵ مع خلاصۂ تفسیر و معارف	۲۷۶
آیت ۶ تا ۱۱ مع خلاصۂ تفسیر و معارف	۲۸۲
ایک عبرت کا سبق	۲۸۵
آیت ۱۲ تا ۱۴ مع خلاصۂ تفسیر و معارف	۲۸۸
آیت ۱۵ تا ۲۱ مع خلاصۂ تفسیر	۲۹۰
اسلام کا انقلابی عقیدہ، نفع و ضرر کا مالک صرف ایک اللہ ہے	۲۹۳
آیت ۲۲ تا ۲۶ مع خلاصۂ تفسیر	۲۹۷
کیفیت عدم فلاح مشرکین	۲۹۸
معارف و مسائل	۲۹۹
آیت ۲۷ تا ۳۲ مع خلاصۂ تفسیر	۳۰۵
معارف و مسائل، اسلام کے تین بنیادی اصول	۳۰۷
آیت ۳۳ تا ۴۱ مع خلاصۂ تفسیر	۳۱۱
کفار کے بیہودہ کلمات پر رسولؐ کی تسلی	۳۱۳
معارف و مسائل	۳۱۵
حقوق خلق کی انتہائی اہمیت	۳۱۶
آیت ۴۲ تا ۴۵ مع خلاصۂ تفسیر	۳۱۷
معارف و مسائل	۳۱۸
آیت ۴۶ تا ۴۹ مع خلاصۂ تفسیر	۳۲۲
آیت ۵۰ تا ۵۱ مع خلاصۂ تفسیر	۳۲۳
معارف و مسائل	۳۲۴
کفار عرب کی طرف سے فرمائشی معجزات کا معاندانہ مطالبہ	〃
آیت ۵۲ تا ۵۵ مع خلاصۂ تفسیر	۳۲۹
معارف و مسائل	۳۳۱
عزت و ذلت کا اسلامی معیار، امیر غریب	〃
میں کوئی امتیاز نہیں	
چند احکام و ہدایات	۳۳۶
توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے	۳۳۹
آیت ۵۶ تا ۵۸ مع خلاصۂ تفسیر	۳۴۱
آیت ۵۹ تا ۶۲ مع خلاصۂ تفسیر	۳۴۲
معارف و مسائل	۳۴۴
گناہوں سے بچنے کا نسخۂ اکسیر	〃
قرآنی اصطلاح میں علم غیب اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے کوئی دوسرا اسمیں شریک نہیں	۳۴۵

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
معارف ومسائل	۵۳۳	آیت ۴۴ تا ۴۹ مع خلاصۂ تفسیر	۵۶۳
لباس کے دو فائدے	۵۳۴	معارف ومسائل	۳۶۵
انسان پر شیطان کا پہلا حملہ اور آجکل کی نئی تہذیب	″	اہل اعراف کون لوگ ہیں؟	۵۶۶
ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی ہے	″	سلام کا مسنون لفظ	۵۶۸
نیا لباس پہننے کے وقت پرانے لباس کو صدقہ کرنے کا ثواب	۵۳۵	آیت ۵۰ تا ۵۳ مع خلاصۂ تفسیر	۵۶۹
ستر پوشی ابتدائے آفرینش سے انسان کا فطری عمل ہے	″	آیت ۵۴، مع خلاصۂ تفسیر	۵۷۱
لباس کی ایک تیسری قسم	″	معارف ومسائل	″
ظاہری لباس کا بھی اصل مقصد تقوی حاصل کرنا ہے	۵۳۶	آسمان و زمین کی تخلیق میں چھ روز کی مدت کیوں لگی	۵۷۲
آیت ۲۸ تا ۳۱ مع خلاصۂ تفسیر	۵۳۷	تخلیق زمین و آسمان و سیارات سے پہلے دن رات کیسے پہچانے گئے؟	″
معارف ومسائل	۵۳۸	آیت ۵۵، ۵۶ مع خلاصۂ تفسیر	۵۷۵
نماز میں ستر پوشی فرض ہے	۵۴۳	معارف ومسائل	۵۷۶
نماز کے لئے اچھا لباس	″	احکام دعاء اور اس کے آداب	″
نماز کے لباس کے متعلق چند مسائل	″	زمین کی درستی اور خرابی کیا ہے؟	۵۸۰
کھانا پینا بقدر ضرورت فرض ہے	۵۴۴	دعاء کے مزید دو آداب	۵۸۴
اشیاء عالم میں اصل اباحت ہے جب تک کسی دلیل سے حرمت ثابت نہ ہو	۵۴۵	آیت ۵۷، ۵۸ مع خلاصۂ تفسیر	۵۸۵
کھانے پینے میں اسراف جائز نہیں	″	معارف ومسائل	۵۸۶
کھانے پینے میں اعتدال ہی نافع دین و دنیا ہے	″	آیت ۵۹ تا ۶۴ مع خلاصۂ تفسیر	۵۹۰
ایک آیت سے آٹھ مسائل شرعیہ	۵۴۶	معارف ومسائل، واقعہ قوم نوح	۵۹۱
آیت ۳۲ تا ۳۴ مع خلاصۂ تفسیر	۵۴۷	آیت ۶۵ تا ۷۲ مع خلاصۂ تفسیر	۵۹۶
معارف ومسائل	۵۴۹	معارف ومسائل، عاد اور ثمود کی مختصر تاریخ	۵۹۹
عمدہ لباس اور لذیذ کھانے سے پرہیز اسلام کی تعلیم نہیں	″	حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ اور بعض حالات	۶۰۰
خوراک و پوشاک میں سنت نبوی	۵۵۰	آیت ۷۳ تا ۷۶ مع خلاصۂ تفسیر	۶۰۳
آیت ۳۵ تا ۳۹ مع خلاصۂ تفسیر	۵۵۳	معارف ومسائل، واقعہ ثمود	۶۰۵
آیت ۴۰ تا ۴۳ مع خلاصۂ تفسیر	۵۵۶	چند احکام و مسائل	۶۰۸
معارف ومسائل	۵۵۷	آیت ۷۷ تا ۷۹ مع خلاصۂ تفسیر	۶۰۹
احکام شریعت میں سہولت کی رعایت	۵۶۰	معارف ومسائل	۶۱۰
اہل جنت کے دل سے باہمی کدورتیں نکال لی جائیں گی	۵۶۱	آیت ۸۰ تا ۸۴ مع خلاصۂ تفسیر	۶۱۴
ہدایت کے مختلف درجات ہیں جن کا آخری درجہ دخول جنت ہے	۵۶۲	معارف ومسائل، واقعہ قوم لوط	۶۱۵
		آیت ۸۵ تا ۸۷ مع خلاصۂ تفسیر	۶۱۹
		معارف ومسائل، واقعہ اہل مدین	۶۲۱
		آیت ۸۸ تا ۹۳ مع خلاصۂ تفسیر	۶۲۵
		معارف ومسائل	۶۲۸

سُورَةُ المَائِدَة

(یہ سورت مدنی ہے، اس میں ایک سو بیس ۱۲۰ آیات اور سولہ ۱۶ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ

اے ایمان والو پورا کرو عہدوں کو حلال ہوئے تمہارے لئے

بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي

چوپائے مویشی سوائے ان کے جو تم کو آگے سنائے جاویں گے

الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

مگر حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں اللہ حکم کرتا ہے جو چاہے

سُورت کا شانِ نزول اور خُلاصۂ مَضامین

یہ سورۂ مائدہ کی ابتدائی آیت ہے۔ سورۂ مائدہ بالاتفاق مدنی سورۃ ہے اور مدنی سورتوں میں بھی آخری سورت ہے یہاں تک کہ بعض حضرات نے اس کو قرآن کی آخری سورت بھی کہا ہے۔ مسند احمد میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ و اسماء بنت یزید منقول ہے کہ سورۂ مائدہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ سفر میں عضبا نامی اونٹنی پر سوار تھے۔ نزول وحی کے وقت جو غیر معمولی ثقل اور بوجھ ہوا کرتا تھا حسب دستور اس وقت بھی ہوا۔ یہاں تک کہ اونٹنی عاجز ہوگئی۔ تو آپؐ اس سے نیچے اتر آئے۔ یہ سفر بظاہر حجۃ الوداع

کا سفر ہے جیسا کہ بعض روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ حجۃ الوداع ہجرت کے دسویں سال میں ہوا، اور اس سے واپسی کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دنیوی حیات تقریباً اسّی دن رہی ابن حیان نے بحر محیط میں فرمایا کہ سورۂ مائدہ کے بعض اجزاء سفر حدیبیہ میں اور بعض فتح مکہ کے سفر میں اور بعض حجۃ الوداع کے سفر میں نازل ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت نزولِ قرآن کے آخری مراحل میں نازل ہوئی ہے خواہ بالکل آخری سورت نہ ہو۔

رُوح المعانی میں بحوالہ ابو عبید حضرت حمزہ بن حبیب اور عطیہ بن قیس کی یہ روایت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ المائدۃ من اٰخر القراٰن تنزیلا فاحلوا حلالھا وحرموا حرامھا۔ یعنی سورۂ مائدہ اُن چیزوں میں سے ہے جو نزولِ قرآن کے آخری دور میں نازل کی گئی ہیں۔ اس میں جو چیز حلال کی گئی ہے اس کو ہمیشہ کے لئے حلال اور جو چیز حرام کی گئی ہے اس کو ہمیشہ کے لئے حرام سمجھو۔

اسی قسم کی ایک روایت ابن کثیر نے مستدرک حاکم کے حوالہ سے حضرت جبیر بن نفیر رح سے نقل کی ہے کہ وہ حج کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضہ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا جبیر تم سورۂ مائدہ پڑھتے ہو۔ انھوں نے عرض کیا ہاں پڑھتا ہوں۔ صدیقہ رضہ نے فرمایا کہ یہ قرآن پاک کی آخری سورۃ ہے اس میں جو احکام حلال و حرام کے آئے ہیں وہ محکم ہیں۔ ان میں نسخ کا احتمال نہیں ہے۔ ان کا خاص اہتمام کرو۔ سورۂ مائدہ میں بھی سورۂ نساء کی طرح فروعی احکام، معاملات، معاہدات وغیرہ کے زیادہ بیان کئے گئے ہیں۔ اسی لئے روح المعانی نے فرمایا ہے کہ سورۂ بقر اور سورۂ آلِ عمران باعتبار مضامین کے متحد ہیں۔ کیونکہ ان میں زیادہ تر احکام اصول عقائد، توحید، رسالت، قیامت وغیرہ کے آئے ہیں۔ فروعی احکام ضمنی ہیں اور سورۂ نساء اور مائدہ باعتبار مضامین کے متحد ہیں کہ ان دونوں میں بیشتر فروعی احکام کا بیان ہے، اصول کا بیان ضمنی ہے۔ سورۂ نساء میں باہمی معاملات اور حقوق العباد پر زور دیا گیا ہے۔ شوہر بیوی کے حقوق، یتیموں کے حقوق، والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں بھی ان تمام معاملات اور معاہدات کی پابندی اور ان کے پورا کرنے کی ہدایت آئی ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اسی لئے سورۂ مائدہ کا دوسرا نام سورۂ عقود بھی ہے۔ (بحر محیط)

معاہدات اور معاملات کے بارہ میں یہ سورۃ اور بالخصوص اس کی ابتدائی آیت ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب عمرو بن حزم رض کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجا اور ایک فرمان لکھ کر اُن کے حوالہ کیا۔ تو اس فرمان کے

سرنامہ پر آپ نے یہ آیت تحریر فرمائی تھی۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! تمھارے ایمان کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے عہدوں کو (جو کہ ایمان کے ضمن میں تم نے خدا تعالےٰ سے کئے ہیں) پورا کرو (یعنی احکام شرعیہ کو بجالاؤ، کیونکہ ایمان لانے سے سب کا التزام ہو گیا اور التزام کا مقتضی ایفاء ہے) تمھارے لئے تمام چوپائے جو مشابہ (ان) انعام (یعنی اونٹ، بکری، گائے) کے ہوں (جن کی حلت اس کے قبل سورۂ انعام میں جو کہ مکیہ ہے معلوم ہو چکی ہے، پس ان کے مشابہ جتنے چوپائے ہیں) حلال کئے گئے ہیں (جیسے ہرن، نیل گائے، وغیرہ کہ اونٹ بکری گائے کے مشابہ ہیں اس بات میں کہ درندے اور شکاری نہیں بجز ان بہائم کے جو کہ دوسرے دلائل شرعیہ حدیث وغیرہ سے مخصوص و مستثنیٰ ہو چکے ہیں۔ جیسے گدھا، خچر وغیرہ۔ ان مستثنیات کے سوا اور سب بہائم اہلی و وحشی حلال ہیں) مگر جن کا ذکر آگے (آیۃ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ الخ میں) آتا ہے (کہ وہ باوجود بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ میں داخل ہونے اور مخصوص بالحدیث وغیرہ سے خارج ہونے کے بھی حرام ہیں۔ اور باقی تم کو حلال ہیں) لیکن (ان میں) جو شکار (ہیں ان) کو حلال مت سمجھنا جس حالت میں کہ تم احرام (یا حرم) میں ہو (مثلاً حج و عمرہ کا احرام باندھے ہو گو حرم سے خارج ہو یا یہ کہ حرم کے اندر ہو کہ غالباً شکار بھی حرم کے اندر ہوگا، کیونکہ اصل مدار حکم کا شکار کا حرم کے اندر ہونا ہے گو احرام نہ باندھے ہو، دونوں حالتوں میں شکار یعنی بری وحشی کا حرام ہے) بے شک اللہ تعالےٰ جو چاہیں حکم کریں۔ یعنی وہی مصلحت ہوتا ہے، پس جس جانور کو چاہا ہمیشہ کے لئے فی نفسہٖ غیر اوقات اضطرار میں حرام کر دیا جس کو چاہا ہمیشہ کے لئے حلال کر دیا۔ جس کو چاہا کسی حالت میں حلال کر دیا کسی حالت میں حرام کر دیا۔ تم کو ہر حالت میں امتثال واجب ہے۔

معارف و مسائل

اس سورت کی پہلی آیت کا پہلا جزو ایک ایسا جامع جملہ ہے کہ اس کی تشریح و تفسیر میں ہزاروں صفحات لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے گئے ہیں ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ یعنی اے ایمان والو اپنے معاہدوں کو پورا کیا کرو۔ اس میں پہلے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب فرما کر مضمون کی اہمیت کی طرف متوجہ کر دیا گیا کہ اس میں

جو حکم ہے وہ عین ایمان کا تقاضا ہے۔ اس کے بعد حکم فرمایا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔ لفظ عقود عقد کی جمع ہے۔ جس کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں۔ اور جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اس کو بھی عقد کہا جاتا ہے۔ اس لئے بمعنی عہود ہو گیا۔

امام تفسیر ابن جریر نے مفسرین صحابہ و تابعین کا اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام جصاص نے فرمایا کہ عقد کہا جائے یا عہد و معاہدہ اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو۔ اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں۔ ہمارے عرف میں اسی کا نام معاہدہ ہے اسی لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہو گیا کہ باہمی معاہدات کا پورا کرنا لازم و ضروری سمجھو۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان معاہدات سے کون سے معاہدات مراد ہیں۔ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال بظاہر مختلف نظر آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے اس سے مراد وہ معاہدات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے ایمان و طاعت کے متعلق لئے ہیں۔ یا وہ معاہدات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کئے ہوئے احکام حلال و حرام سے متعلق اپنے بندوں سے لئے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضہ سے یہی منقول ہے اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے اس جگہ وہ معاہدات مراد ہیں جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کر لیا کرتے ہیں۔ جیسے معاہدہ نکاح، معاہدہ بیع و شراء وغیرہ مفسرین میں سے ابن زید اور زید بن اسلم اسی طرف گئے ہیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے وہ حلف اور معاہدے مراد ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں ایک دوسرے سے باہمی امداد کے لئے لیا کرتے تھے۔ مجاہد، ربیع، قتادہ وغیرہ، مفسرین نے بھی یہی فرمایا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔ بلکہ یہ سب قسم کے معاہدات لفظ عقود کے تحت میں داخل ہیں اور سبھی پورے کرنے کے لئے قرآن کریم نے ہدایت دی ہے۔

اسی لئے امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں اور پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ معاہدہ جو انسان کا رب العالمین کے ساتھ ہے۔ مثلاً ایمان، طاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد ——— دوسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے، جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے، یا حلف کر کے کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کرے، تیسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ اور اس تیسری قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

حکومتوں کے بین العالمی معاہدات۔ یا باہمی سمجھوتے۔ جماعتوں کے باہمی عہد و میثاق

اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات نکاح، تجارت، شرکت، اجارہ، ہبہ وغیرہ ان تمام معاہدات میں جو جائز شرطیں باہم طے ہو جائیں اس آیت کی رو سے ان کی پابندی ہر فریق پر لازم و واجب ہے۔ اور جائز کی قید اس لئے لگائی کہ خلاف شرع شرط لگانا یا اس کا قبول کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔

اس کے بعد آیت کے دوسرے جملہ میں اس عام ضابطہ کی خاص جزئیات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ۔ لفظ بہیمہ ان جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے، جن کو عادۃً غیر ذوی العقول سمجھا جاتا ہے کیونکہ لوگ ان کی بولی کو عادۃً نہیں سمجھتے تو ان کی مراد مبہم رہتی ہے۔ اور امام شعرانی رح نے فرمایا کہ بہیمہ کو بہیمہ اس لئے نہیں کہتے کہ اس کو عقل نہیں اور عقل کی باتیں اس پر مبہم رہتی ہیں۔ جیسا کہ لوگوں کا عام خیال ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عقل و ادراک سے کوئی جانور بلکہ کوئی شجر و حجر بھی خالی نہیں۔ ہاں درجات کا فرق ضرور ہے۔ ان چیزوں میں اتنی عقل نہیں ہے جتنی انسان میں اسی لئے انسان کو احکام کا مکلف بنایا گیا ہے۔ جانوروں کو مکلف نہیں بنایا گیا۔ ورنہ اپنی ضروریات زندگی کی حد تک ہر جانور بلکہ ہر شجر و حجر کو حق تعالیٰ نے عقل و ادراک بخشا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔ عقل نہ ہوتی تو اپنے خالق و مالک کو کس طرح پہچانتی اور کس طرح تسبیح کرتی۔

امام شعرانی کے فرمانے کا خلاصہ یہ ہے کہ بہیمہ کو بہیمہ اس لئے نہیں کہتے کہ اس کی بے عقلی کے سبب معلومات اس پر مبہم رہتے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس کی بولی لوگ نہیں سمجھتے۔ اس کا کلام لوگوں پر مبہم رہتا ہے۔ بہرحال لفظ بہیمہ ہر جاندار کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چوپایہ جانداروں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اور لفظ انعام نعم کی جمع ہے۔ پالتو جانور جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بکری وغیرہ جن کی آٹھ قسمیں سورۂ انعام میں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ان کو انعام کہا جاتا ہے۔ بھیمہ کا لفظ عام تھا۔ انعام کے لفظ نے اس کو خاص کر دیا۔ مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ گھریلو جانوروں کی آٹھ قسمیں تمہارے لئے حلال کر دی گئیں۔ لفظ عقود کے تحت میں ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ تمام معاہدات داخل ہیں۔ ان میں سے ایک معاہدہ وہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے حلال و حرام کی پابندی کے متعلق لیا ہے۔ اس جملہ میں اس خاص معاہدہ کا بیان آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اونٹ، بکری، گائے، بھینس وغیرہ کو حلال کر دیا ہے۔ ان کو شرعی قاعدہ کے موافق ذبح کر کے کھا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی ان حدود کے اندر رکھ کر پابندی کرو۔ نہ تو مجوسی اور بت پرستوں کی طرح مطلقاً ان جانوروں کے ذبح ہی کو حرام قرار دو کہ یہ حکمت حق جل شانہٗ پر اعتراض اور اس کی نعمت کی ناشکری ہے۔ اور نہ دوسرے گوشت خور فرقوں کی طرح بے قید ہو کر ہر طرح کے جانور کو کھا جاؤ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کے تحت جن جانوروں کو اس نے حلال کیا ہے اُن کو کھاؤ۔ اور جن جانوروں کو حرام قرار دیا ہے اُن سے بچو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی خالق کائنات ہیں۔ وہ ہر جانور کی حقیقت اور خواص سے اور انسان کے اندر ان سے پیدا ہونے والے اثرات سے واقف ہیں۔ وہ طیبات یعنی پاک اور ستھری چیزوں کو انسان کے لئے حلال کر دیتے ہیں۔ جن کے کھانے سے انسان کی جسمانی صحت پر یا روحانی اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑے اور گندے ناپاک جانوروں سے منع فرماتے ہیں۔ جو انسانی صحت کے لئے مہلک ہیں یا اُن کے اخلاق خراب کرنے والے ہیں۔ اسی لئے اس حکم عام سے چند چیزوں کا استثنا فرمایا۔

پہلا استثنا یہ ہے، اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ۔ یعنی بجز ان جانوروں کے جنکی حرمت قرآن میں بیان کر دی گئی ہے۔ مثلاً مُردار جانور یا خنزیر وغیرہ۔ دوسرا استثنا یہ۔ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ سے فرمایا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ چوپائے جانور تمھارے لئے حلال ہیں، اور جنگل کا شکار بھی حلال ہے۔ مگر جبکہ تم نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا ہوا ہو، تو اس وقت شکار کرنا جرم و گناہ ہے اس سے بچو۔ آخر آیت میں ارشاد فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے کسی کو حق نہیں کہ اس کے ماننے میں چون وچرا کرے۔ اس میں شاید اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کیلئے بعض جانوروں کو ذبح کر کے کھانے کی اجازت کوئی ظلم نہیں۔ جس مالک نے یہ سب جانیں بنائی ہیں۔ اسی نے پوری حکمت و بصیرت کے ساتھ یہ قانون بھی بنایا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے لئے غذا بنایا ہے زمین کی مٹی درختوں کی غذا ہے۔ اور درخت جانوروں کی غذا۔ اور جانور انسان کی غذا۔ انسان سے اعلیٰ کوئی مخلوق اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس لئے انسان کسی کی غذا نہیں بن سکتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ

اے ایمان والو حلال نہ سمجھو اللہ کی نشانیوں کو اور نہ ادب والے

الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ

مہینہ کو اور نہ اس جانور کو جو نیاز کعبہ کی ہو اور نہ جن کے گلے پٹا ڈالے کہ پہچانیں کعبہ کو اور نہ آنیوالوں

الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا حَلَلْتُمْ

کو حرمت والے گھر کی طرف جو ڈھونڈتے ہیں فضل اپنے رب کا اور اس کی خوشی اور جب احرام سے نکلو تو

فَاصْطَادُوْا ۭ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ

شکار کر لو اور باعث نہ ہو تم کو اس قوم کی دشمنی جو کہ تم کو روکتی تھی

عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ

حرمت والی مسجد سے اس پر کہ زیادتی کرنے لگو اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور

وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا

پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر اور ڈرتے رہو

اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲

اللہ سے بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔

ربطِ آیات سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں معاہدات کے پورا کرنے کی تاکید تھی۔ ان معاہدات میں سے ایک معاہدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حلال و حرام کی پابندی کی جائے۔ اس دوسری آیت میں اس معاہدہ کی دو اہم دفعات کا بیان ہے۔ ایک شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کی بیحرمتی سے بچنے کی ہدایت، دوسرے اپنے اور غیر دوست اور دشمن سب کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور ظلم کا بدلہ ظلم سے لینے کی ممانعت۔

اس آیت کے نزول کا سبب چند واقعات ہیں۔ پہلے ان کو سن لیجئے تاکہ آیت کا مضمون پوری طرح دلنشیں ہو سکے۔ ایک واقعہ حدیبیہ کا ہے جس کی تفصیل قرآن نے دوسری جگہ بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ ہجرت کے چھٹے سال میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ارادہ کیا کہ عمرہ کریں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک ہزار سے زائد صحابہ کے ساتھ احرام عمرہ باندھ کر بقصد مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ مکہ کے قریب مقام حدیبیہ میں پہنچ کر مکہ والوں کو اطلاع دی کہ ہم کسی جنگ یا جنگی مقصد کے لئے نہیں بلکہ صرف عمرہ کرنے کے لئے آرہے ہیں۔ ہمیں اس کی اجازت دو۔ مشرکین مکہ نے اجازت نہ دی۔ اور بڑی سخت اور کڑی شرطوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ اس وقت سب اپنے احرام کھول دیں اور واپس جائیں۔ آئندہ سال عمرہ کے لئے اس طرح آئیں کہ ہتھیار ساتھ نہ ہوں۔ صرف تین روز ٹھہریں۔ اور عمرہ کر کے چلے جائیں۔ اور بھی بہت سی ایسی شرائط تھیں جن کا تسلیم کر لینا بظاہر مسلمانوں کے وقار و عزت کے منافی تھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سب مطمئن ہو کر واپس ہو گئے۔ پھر ۷ھ میں دوبارہ ماہ ذی قعدہ میں انھیں شرائط کی پابندی کے ساتھ یہ عمرہ قضا کیا گیا۔ بہرحال واقعہ حدیبیہ اور ان توہین

آمیز شرائط نے صحابہ کرام کے قلوب میں مشرکین مکہ کی طرف سے انتہائی نفرت و بغض کا بیج بو دیا تھا۔

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ مشرکین مکہ میں سے حطیم بن ہند اپنا مال تجارت لے کر مدینہ طیبہ آیا۔ اور مال فروخت کرنے کے بعد اپنا سامان اور آدمی مدینہ سے باہر چھوڑ کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور منافقانہ طور پر اپنا ارادہ اسلام لانے کا ظاہر کیا تاکہ مسلمان اس سے مطمئن ہو جائیں۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے آنے سے پہلے ہی بذریعہ وحی خبر پاکر صحابہ کرام کو بتلا دیا تھا کہ ہمارے پاس ایک شخص آنے والا ہے جو شیطان کی زبان سے کلام کرے گا۔ اور جب یہ واپس گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ شخص کفر کے ساتھ آیا اور دھوکہ غداری کیساتھ لوٹا ہے یہ شخص آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے نکل کر سیدھا مدینہ سے باہر پہنچا۔ جہاں اہل مدینہ کے جانور چر رہے تھے ان کو ہنکا کر ساتھ لے گیا۔ صحابہ کرام کو اس کی اطلاع کچھ دیر میں ہوئی۔ تعاقب کے لئے نکلے تو وہ ان کی زد سے باہر ہو چکا تھا۔ پھر جب ہجرت کے ساتویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ حدیبیہ کی قضا کے لئے جا رہے تھے تو دور سے تلبیہ کی آواز سنی اور دیکھا کہ یہی حطیم بن ہند اہل مدینہ کے ان جانوروں کو جو مدینہ سے لایا تھا بطور قربانی کے اپنے ساتھ لئے ہوئے عمرہ کرنے جا رہا ہے۔ اس وقت صحابہ کرام کا قصد ہوا کہ اس پر حملہ کر کے اپنے جانور چھین لیں اور اس کو یہیں ختم کر دیں۔

تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ ہجرت کے آٹھویں سال رمضان المبارک میں مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور تقریباً پورے عرب پر اسلامی قبضہ ہو گیا۔ اور مشرکین مکہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی انتقام کے آزاد فرما دیا۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنے سب کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے جاہلانہ طرز پر حج و عمرہ کی رسوم بھی ادا کرتے رہے۔ اس وقت بعض صحابہ کرام کے دل میں واقعہ حدیبیہ کا انتقام لینے کا خیال آیا کہ انھوں نے ہمیں جائز اور حق طریق پر عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ ہم ان کے ناجائز اور غلط طریق کے عمرہ و حج کو کیوں آزاد چھوڑیں، ان پر حملہ کریں، ان کے جانور چھین لیں اور ان کو ختم کر دیں۔

یہ واقعات ابن جریر نے بروایت عکرمہ و سدی نقل کئے ہیں۔ یہ چند واقعات تھے کہ جن کی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ شعائر اللہ کی تعظیم تمہارا اپنا فرض ہے۔ کسی دشمن کے بغض و عداوت کی وجہ سے اس میں خلل ڈالنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ اشہر حرم میں قتل و قتال بھی جائز نہیں۔ قربانی کے جانوروں کو حرم تک جانے سے روکنا یا ان کا چھین لینا بھی جائز نہیں اور جو مشرکین احرام باندھ کر اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کے فضل و رضا حاصل کرنے کے قصد سے چلے ہیں۔ (اگرچہ بوجہ کفران کا یہ خیال خام ہے

تاہم) شعائر اللہ کی حفاظت و احترام کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ نیز وہ لوگ جنھوں نے تمھیں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ ان کے بغض و عداوت کا انتقام اس طرح لینا جائز نہیں کہ مسلمان ان کو مکہ میں داخل ہونے یا شعائر حج ادا کرنے سے روک دیں۔ کیونکہ یہ ان کے ظلم کے بدلہ میں ہماری طرف سے ظلم ہو جائے گا، جو اسلام میں روا نہیں۔ اب آیت کی پوری تفسیر دیکھئے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو بے حرمتی نہ کرو خدا تعالیٰ (کے دین) کی نشانیوں کی (یعنی جن چیزوں کے ادب کی حفاظت کے واسطے خدا تعالیٰ نے کچھ احکام مقرر کئے ہیں۔ ان احکام کے خلاف کر کے ان کی بے ادبی نہ کرو، مثلاً حرم اور احرام کا یہ ادب مقرر کیا ہے کہ اس میں شکار نہ کرو تو شکار کرنا بے ادبی اور حرام ہوگا) اور نہ حرمت والے مہینے کی (بے ادبی کرو کہ اس میں کافروں سے لڑنے لگو) اور نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانور کی (بے ادبی کرو کہ اس سے تعرض کرنے لگو) اور نہ ان جانوروں کی (بے ادبی کرو) جن کے گلے میں (اس نشانی کے لئے) پٹے پڑے ہوں (کہ یہ اللہ کی نیاز ہیں حرم میں ذبح ہوں گے) اور نہ ان لوگوں کی (بے حرمتی کرو) جو کہ بیت الحرام (یعنی بیت اللہ) کے قصد سے جا رہے ہوں (اور) اپنے رب کے فضل اور رضامندی کے طالب ہوں (یعنی ان چیزوں کے ادب سے کافروں کے ساتھ بھی تعرض مت کرو) اور (اوپر کی آیت میں جو احرام کے ادب سے شکار کو حرام فرمایا گیا ہے وہ احرام ہی تک ہے ورنہ) جس وقت تم احرام سے باہر آجاؤ تو (اجازت ہے کہ) شکار کیا کرو (بشرطیکہ وہ شکار حرم میں نہ ہو) اور (اوپر جن چیزوں کے تعرض سے منع کیا گیا ہے اس میں) ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم سے جو اس سبب سے بغض ہے کہ انھوں نے (تم کو سال حدیبیہ میں) مسجد حرام (میں جانے) سے روک دیا تھا (مراد کفار قریش ہیں) وہ (بغض) تمھارے لئے اس کا باعث ہو جاوے کہ تم (شرع کی) حد سے نکل جاؤ۔ (یعنی احکام مذکورہ کے خلاف کر بیٹھو، ایسا نہ کرنا) اور نیکی اور تقویٰ (کی باتوں میں) ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو (مثلاً یہ احکام ہیں کہ ان میں دوسروں کو بھی عمل کرنے کی ترغیب دو) اور گناہ اور زیادتی (کی باتوں میں) ایک دوسرے کی اعانت مت کرو (مثلاً یہی احکام ہیں اگر کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو تم اس کی اعانت مت کرو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو (کہ اس سے سب احکام کی پابندی سہل ہو جاتی ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (احکام کی مخالفت کرنے والے کو) سخت

سزا دینے والے ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ یعنی اے ایمان والو اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ اس میں لفظ شعائر جس کا ترجمہ نشانیوں سے کیا گیا ہے شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت، اسی لئے شعائر اور شعیرہ اس محسوس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی علامت ہو۔ شعائر اسلام ان اعمال و افعال کو کہا جائیگا جو عرفاً مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور محسوس و مشاہد ہیں جیسے نماز، اذان، حج، ختنہ اور سنت کے موافق داڑھی وغیرہ۔ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ کی تفسیر اس آیت میں مختلف الفاظ سے منقول ہے مگر صاف بات وہ ہے جو بحر محیط اور روح المعانی میں حضرت حسن بصری اور عطاء رح سے منقول ہے اور امام جصاص نے اس کو تمام اقوال کے لئے جامع فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ شعائر اللہ سے مراد تمام شرائع اور دین کے مقرر کردہ واجبات و فرائض اور ان کی حدود ہیں۔ اس آیت میں لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ کے ارشاد کا یہی حاصل ہے کہ اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو۔ اور شعائر اللہ کی بے حرمتی ایک تو یہ ہے کہ سرے سے ان احکام کو نظر انداز کر دیا جائے۔ دوسرے یہ ہے کہ ان پر عمل تو کریں مگر ادھورا کریں، پورا نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے آگے بڑھنے لگیں۔ لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ میں ان تینوں صورتوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

یہی ہدایت قرآن کریم نے دوسرے عنوان سے اس طرح ارشاد فرمائی ہے وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ یعنی جو شخص اللہ کی حرمات کی تعظیم کرے تو وہ دلوں کے تقویٰ کا اثر ہے۔ آیت کے دوسرے جملہ میں شعائر اللہ کی ایک خاص قسم یعنی شعائر حج کی کچھ تفصیلات بتائی گئی ہیں۔

ارشاد ہے۔ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْیَ وَلَا الْقَلَآىِٕدَ وَلَآ اٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا۔ یعنی شہر حرام میں قتل و قتال کر کے اسکی بے حرمتی نہ کرو۔ اشہر حرم وہ چار مہینے ہیں جن میں باہمی جنگ کرنا شرعاً حرام تھا۔ ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب بعد میں یہ حکم جمہور علماء کے نزدیک منسوخ ہو گیا، نیز حرم مکہ میں قربان ہونے والے جانور اور خصوصاً وہ جنکے گلے میں قربانی کی علامت کے طور پر قلادہ ڈالا گیا، انکی بے حرمتی نہ کرو۔ ان جانوروں کی بے حرمتی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ان کو حرم تک پہنچنے سے

روک دیا جائے یا چھین لیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے قربانی کے علاوہ کوئی دوسرا کام سواری یا دودھ حاصل کرنے وغیرہ کا لیا جائے۔ آیت نے ان سب صورتوں کو ناجائز قرار دے دیا۔

پھر فرمایا۔ وَلَآ اٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا یعنی ان لوگوں کی بے حرمتی نہ کرو جو حج کے لئے مسجد الحرام کا قصد کر کے گھر سے نکلے ہیں۔ اور اس سفر سے ان کا مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا فضل اور رضا حاصل کریں۔ ان لوگوں کی بے حرمتی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سفر میں ان سے مزاحمت نہ کی جائے۔ نہ کوئی تکلیف پہنچائی جائے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا۔ یعنی پہلی آیت میں بحالت احرام شکار کی جو ممانعت کی گئی ہے، اس کی حد بتلا دی گئی کہ جب تم احرام سے فارغ ہو جاؤ تو شکار کرنے کی ممانعت ختم ہو گئی۔ اب شکار کر سکتے ہو۔

آیت متذکرہ میں اس معاہدہ کے اہم جزء کا بیان ہو رہا ہے جو ہر انسان اور رب العالمین کے درمیان ہے۔ اس کے چند اجزاء کا یہاں تک بیان ہوا ہے۔ جس میں اول مطلقاً شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کی بے حرمتی سے بچنے کی ہدایت ہے اور پھر خاص طور پر ان شعائر اللہ کی کچھ تفصیلات ہیں جو حج سے متعلق ہیں۔ ان میں بقصد حج آنے والے مسافروں اور ان کے ساتھ آنے والے قربانی کے جانوروں سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کرنے اور ان کی بے حرمتی سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

اس کے بعد معاہدہ کا دوسرا جزء اس طرح ارشاد فرمایا۔ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا۔ یعنی جس قوم نے تم کو واقعہ حدیبیہ کے وقت مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ اور تم سخت غم و غصہ کے ساتھ ناکام واپس آ رہے تھے۔ اب جبکہ تم کو قوت اور قدرت حاصل ہے تو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ پچھلے واقعہ کے غم و غصہ اور بغض کا انتقام اس طرح لیا جائے کہ تم ان کو بیت اللہ اور مسجد حرام میں داخل ہونے اور حج کرنے سے روکنے لگو۔ کیونکہ یہ ظلم ہے۔ اور اسلام ظلم کا انتقام ظلم سے لینا نہیں چاہتا۔ بلکہ ظلم کے بدلہ میں انصاف کرنا اور انصاف پر قائم رہنا سکھلاتا ہے۔ انھوں نے اپنی قوت و اقتدار کے وقت مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے ظلماً روک دیا تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ اب مسلمان اپنے اقتدار کے وقت ان کو ان افعال حج سے روک دیں۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ عدل و انصاف میں دوست و دشمن سب برابر ہونے چاہئیں

تمھارا دشمن کیسا ہی سخت ہو اور اس نے تمھیں کیسی ہی ایذا پہنچائی ہو اس کے معاملہ بھی انصاف ہی کرنا تمھارا فرض ہے۔

یہ اسلام ہی کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ دشمنوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور ان کے ظلم کا جواب ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دینا سکھاتا ہے۔

باہمی تعاون و تناصر کا قرآنی اصول

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

یہ سورۂ مائدہ کی دوسری آیت کا آخری جملہ ہے۔ اس میں قرآن حکیم نے ایک ایسے اصولی اور بنیادی مسئلہ کے متعلق ایک حکیمانہ فیصلہ دیا ہے جو پورے نظام عالم کی رُوح ہے۔ اور جس پر انسان کی ہر صلاح و فلاح بلکہ خود اس کی زندگی اور بقا موقوف ہے وہ مسئلہ ہے باہمی تعاون و تناصر کا۔ ہر ذی ہوش انسان جانتا ہے کہ اس دنیا کا پورا انتظام انسانوں کے باہمی تعاون و تناصر پر قائم ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ وہ کتنا ہی عقلمند یا کتنا ہی زور آور یا مالدار ہو، اپنی ضروریات زندگی کو تنہا حاصل نہیں کرسکتا۔ اکیلا انسان نہ اپنی غذا کے لئے غلہ اگانے سے لیکر کھانے کے قابل بنانے تک کے تمام مراحل کو طے کرسکتا ہے۔ نہ لباس وغیرہ کے لئے روئی کی کاشت سے لیکر اپنے بدن کے موافق کپڑا تیار کرنے تک بیشمار مسائل کا حل کرسکتا ہے اور نہ اپنے بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرسکتا ہے۔ غرض ہر انسان اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں دوسرے ہزاروں۔ لاکھوں انسانوں کا محتاج ہے۔ اُن کے باہمی تعاون و تناصر سے ہی سارا دنیا کا نظام چلتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ تعاون دنیوی زندگی ہی میں ضروری نہیں۔ مرنے سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک کے سارے مراحل بھی اسی تعاون کے محتاج ہیں۔ بلکہ اس کے بعد بھی اپنے پیچھے رہنے والوں کی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا محتاج رہتا ہے۔

حق جل شانہٗ نے اپنی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ سے اس جہان کا ایسا محکم نظام بنایا ہے کہ ہر انسان کو دوسرے کا محتاج بنا دیا۔ غریب آدمی پیسوں کے لئے مالدار کا محتاج ہے تو بڑے سے بڑا مالدار بھی محنت و مشقت کے لئے غریب مزدور کا محتاج ہے۔ سوداگر گاہکوں کا محتاج ہے۔ اور گاہک سوداگروں کا۔ مکان بنانے والا معمار۔ لوہار۔ بڑھئی کا محتاج ہے۔ اور یہ سب اس کے محتاج ہیں۔ اگر یہ ہمہ گیر احتیاج نہ ہوتی اور تعاون محض اخلاقی برتری پر رہ جاتا تو کون کس کا کام کرتا۔ اس کا وہی حشر ہوتا جو عام اخلاقی قدروں کا

اس دنیا میں ہو رہا ہے اور اگر یہ تقسیم کار کسی حکومت یا بین الاقوامی ادارہ کی طرف سے بصورت قانون کر بھی دی جاتی تو اس کا بھی وہی انجام ہوتا جو آج پوری دنیا میں دنیا کے قانون کا ہو رہا ہے کہ قانون ایکٹوں میں محفوظ ہے۔ اور بازار اور دفاتر میں رشوت، بے جا رعایت، فرض ناشناسی اور بے عملی کا قانون چل رہا ہے۔ یہ محض حکیم الحکماء، قادر مطلق کا الٰہی نظام ہے کہ مختلف لوگوں کے دلوں میں مختلف کاروبار کی امنگ اور صلاحیت پیدا کر دی۔ انھوں نے اپنی اپنی زندگی کا محور اسی کام کو بنا لیا ؎

ہر یکے را بہر کارے ساختند

میل او را در دلش انداختند

ورنہ اگر کوئی بین الاقوامی ادارہ یا کوئی حکومت لوگوں میں تقسیم کار کرتی اور کسی جماعت کو بڑھئی کے کام کے لئے، کسی کو لوہار کے کام کیلئے، کسی کو خاکروب کے کام کے لئے، کسی کو پانی کے لئے، کسی کو خوراک کے لئے مقرر کرتی۔ تو کون اس کے حکم کی ایسی اطاعت کرتا کہ دن کا چین اور رات کی نیند خراب کر کے اس کام میں لگ جاتا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے ہر انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اس کام کی رغبت اس کے دل میں ڈال دی۔ وہ بغیر کسی قانونی مجبوری کے اس خدمت ہی کو اپنی زندگی کا کام سمجھتا ہے اس کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ اس نظام محکم کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری ضروریات چند ٹکے خرچ کرنے سے بآسانی حاصل ہو جاتی ہیں۔ پکا پکایا کھانا۔ سلا سلایا کپڑا۔ بنا بنایا فرنیچر۔ تیار شدہ مکان سب کچھ ایک انسان کچھ پیسے خرچ کر کے حاصل کر لیتا ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو ایک کروڑپتی انسان اپنی پوری دولت لٹا کر بھی گندم کا ایک دانہ حاصل نہ کرسکتا۔ اسی قدرتی نظام کا نتیجہ ہے کہ آپ ہوٹل میں قیام پذیر ہو کر جس جس چیز سے فائدہ اٹھاتے ہیں اگر ان کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آٹا امریکہ کا۔ گھی پنجاب کا۔ گوشت سندھ کا۔ مسالے مختلف ملکوں کے۔ برتن اور فرنیچر مختلف ملکوں کا۔ کام کرنے والے بیرے باورچی مختلف شہروں کے آپ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ایک لقمہ جو آپ کے منہ تک پہنچتا ہے اس میں لاکھوں مشینوں۔ جانوروں اور انسانوں نے کام کیا ہے۔ تب یہ آپ کے ذائقہ کو سنوار سکا ہے۔ آپ صبح گھر سے نکلتے تین چار میل جانا ہے جس کی طاقت یا فرصت آپ کو نہیں۔ آپ کو اپنے کسی قریبی مقام میں ٹیکسی اور رکشہ یا بس کھڑی ہوئی ملے گی۔ جس کا لوہا آسٹریلیا کا۔ لکڑی برما کی۔ مشینری امریکہ کی۔ ڈرائیور فرنٹیر کا۔ کنڈکٹر یوپی کا۔ یہ کہاں کہاں کے سامان اور کہاں کہاں کی مخلوق آپ کی خدمت کے لئے کھڑی ہے

کہ صرف چند پیسے دے کر آپ ان سب سے خدمت لے لیں۔ ان کو کس حکومت نے مجبور کیا ہے یا کس نے پابند کیا ہے کہ یہ ساری چیزیں آپ کے لئے مہیا کر دیں۔ بجز اس قانونِ قدرت کے جو قلوب کے مالک نے تکوینی طور پر ہر ایک کے دل پر جاری فرما دیا ہے۔

آج کل سوشلسٹ ممالک نے اس قدرتی نظام کو بدل کر ان چیزوں کو حکومت کی ذمہ داری بنا لیا۔ کہ کون انسان کیا کام کرے۔ اس کے لئے ان کو سب سے پہلے جبر و ظلم کے ذریعہ انسانی آزادی سلب کرنا پڑی جس کے نتیجہ میں ہزاروں انسانوں کو قتل کیا گیا۔ ہزاروں کو قید کیا گیا۔ باقی ماندہ انسانوں کو شدید جبر و ظلم کے ذریعہ مشین کے پرزوں کی طرح استعمال کیا۔ جس کے نتیجہ میں اگر کسی جگہ کچھ اشیاء کی پیداوار بڑھ بھی گئی تو انسانوں کی انسانیت ختم کر کے بڑھی۔ تو یہ سودا سستا نہیں پڑا۔ قدرتی نظام میں ہر انسان آزاد بھی ہے اور قدرتی تقسیم طبائع کی بنا پر خاص خاص کاموں کے لئے مجبور بھی اور وہ مجبوری بھی چونکہ اپنی طبیعت سے ہے۔ اس لئے اس کو کوئی بھی جبر محسوس نہیں کرتا۔ سخت سے سخت محنت اور ذلیل سے ذلیل کام کے لئے خود آگے بڑھنے والے اور کوشش کر کے حاصل کرنے والے ہر جگہ ہر زمانے میں ملتے ہیں۔ اور اگر کوئی حکومت ان کو اس کام کے لئے مجبور کرنے لگے تو یہ سب اس سے بھاگنے لگیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری دنیا کا نظام باہمی تعاون پر قائم ہے۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے کہ اگر جرائم۔ چوری۔ ڈاکہ۔ قتل و غارتگری وغیرہ کے لئے یہ باہمی تعاون ہونے لگے۔ چور اور ڈاکوؤں کی بڑی بڑی اور منظم قوی جماعتیں بن جائیں تو یہی تعاون و تناصر اس عالم کے سارے نظام کو درہم برہم بھی کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ باہمی تعاون ایک دودھاری تلوار ہے جو اپنے اوپر بھی چل سکتی ہے۔ اور نظام عالم کو برباد بھی کر سکتی ہے۔ اور یہ عالم چونکہ خیر و شر اور اچھے برے۔ نیک و بد کا ایک مرکب معجون ہے۔ اس لئے اس میں ایسا ہونا کچھ بعید بھی نہ تھا کہ جرائم اور قتل و غارت یا نقصان رسانی کے لئے باہمی تعاون کی قوت استعمال کرنے لگیں۔ اور یہ صرف احتمال نہیں بلکہ واقعہ بن کر دنیا کے سامنے آگیا۔ تو اس کے ردِّ عمل کے طور پر عقلائے دنیا نے اپنے تحفظ کے لئے مختلف نظریوں پر خاص خاص جماعتوں یا قوموں کی بنیاد ڈالی۔ کہ ایک جماعت یا ایک قوم کے خلاف جب کوئی دوسری جماعت یا قوم حملہ آور ہو تو یہ سب ان کے مقابلہ میں باہمی تعاون کی قوت کو استعمال کر کے مدافعت کر سکیں۔

قومیتوں کی تقسیم

عبد الکریم شہرستانی کی ملل و نحل میں ہے کہ شروع میں جب تک انسانی

آبادی زیادہ نہیں تھی تو دنیا کے چار سمتوں کے اعتبار سے چار قومیں بن گئیں۔ مشرقی۔ مغربی۔ جنوبی۔ شمالی۔ ان میں سے ہر ایک سمت کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم اور دوسروں کو دوسری قوم سمجھنے لگے۔ اور اسی بنیاد پر تعاون و تناصر قائم کر لیا۔ اس کے بعد جب آبادی زیادہ پھیلی تو ہر سمت کے لوگوں میں نسبی اور خاندانی بنیادوں پر قومیت اور اجتماعیت کا تصور ایک اصول بن گیا۔ عرب کا سارا نظام اسی نسبی اور قبائلی بنیاد پر تھا۔ اسی پر جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ بنو ہاشم ایک قوم۔ بنو تمیم دوسری قوم۔ بنو خزاعہ تیسری قوم۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں تو آج تک اونچی ذات اور نیچی ذات کی تفریق اسی طرح چل رہی ہے۔

یورپین اقوام کے دورِ جدید نے نہ کوئی اپنا نسب باقی رکھا۔ نہ دنیا کے انساب کو کچھ سمجھا، جب دنیا میں ان کا عروج ہوا تو نسبی اور قبائلی قومیتیں اور تقسیمیں ختم کر کے پھر علاقائی اور صوبائی۔ وطنی اور لسانی بنیادوں پر انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ قومیں کھڑی کر دی گئیں۔ اور آج یہی سکہ تقریباً ساری دنیا میں چل رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ جادو مسلمانوں پر بھی چل گیا۔ عربی۔ ترکی۔ عراقی۔ سندھی کی تقسیمیں ہی نہیں بلکہ ان میں بھی تقسیم در تقسیم ہو کر مصری شامی۔ حجازی۔ نجدی اور پنجابی۔ بنگالی۔ سندھی۔ ہندی وغیرہ کی الگ الگ قوم بن گئی۔ حکومت کے سب کاروبار انہیں بنیادوں پر چلائے گئے۔ یہاں تک کہ یہ صوبائی عصبیت ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اور ہر صوبہ کے لوگوں کا تعاون و تناصر اسی بنیاد پر ہونے لگا۔

قومیت اور اجتماعیت کے لئے قرآنی تعلیم

قرآن کریم نے انسان کو پھر بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ سورۂ نساء کی شروع آیات میں یہ واضح کر دیا کہ تم سب انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان کر دیا کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ فضیلت کا مدار صرف تقویٰ اور اطاعت خدائے تعالیٰ پر ہے۔ اس قرآنی تعلیم نے إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ کا اعلان کر کے حبشہ کے کالے بھجنگ کو سرخ ترکی اور رومی کا، عجم کی نچلی ذات کے انسانوں کو عرب کے قریشی اور ہاشمی کا بھائی بنا دیا۔ قومیت اور برادری اس بنیاد پر قائم کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ماننے والے ایک قوم۔ اور نہ ماننے والے دوسری قوم ہیں۔ یہی وہ بنیاد تھی جس نے ابوجہل اور ابولہب کے خاندانی رشتوں کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے توڑ دیا۔ اور بلال حبشی اور صہیب رومی کا رشتہ جوڑ دیا۔

حسن ز بصرہ بلال ز حبش صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

حتی کہ قرآن کریم نے اعلان کر دیا خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم سب کو پیدا کیا، پھر تم دو حصوں میں بٹ گئے ۔ کچھ کافر ہو گئے ۔ کچھ مؤمن ۔ بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں اسی قرآنی تقسیم کا عملی مظاہرہ ہوا تھا کہ نسبی بھائی جب خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے باہر ہوا تو مسلمان بھائی کا رشتہ اخوت و تعاون اس سے کٹ گیا اور وہ اس کی تلوار کی زد میں آ گیا ۔ نسبی بھائی تلوار لے کر مقابلہ پر آیا تو اسلامی بھائی امداد کے لئے پہونچا ۔ غزوہ بدر و احد اور خندق کے واقعات اس پر شاہد ہیں ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائی یک تن بیگانہ کہ آشنا باشد

آیت مذکورہ میں قرآن حکیم نے تعاون و تناصر کا یہی معقول اور صحیح اصول بتلایا ہے ۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۔ یعنی نیکی اور خدا ترسی پر تعاون کرو ۔ بدی اور ظلم پر تعاون نہ کرو ۔

غور کیجئے کہ اس میں قرآن کریم نے یہ عنوان بھی اختیار نہیں فرمایا کہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ تعاون کرو اور غیروں کے ساتھ نہ کرو ۔ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کی جو اصل بنیاد ہے، یعنی نیکی اور خدا ترسی اسی کو تعاون کرنے کی بنیاد قرار دیا ۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف یا ظلم و جور کی طرف چل رہا ہو تو ناحق اور ظلم پر اس کی بھی مدد نہ کرو ۔ بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ناحق اور ظلم سے اس کا ہاتھ روکو ۔ کیونکہ درحقیقت یہی اس کی صحیح امداد ہے تاکہ ظلم و جور سے اس کی دنیا اور آخرت تباہ نہ ہو ۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ انصر اخاک ظالماً او مظلوماً ۔ یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ۔ صحابہ کرام رضؓ جو قرآنی تعلیم میں رنگے جا چکے تھے، انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ یا رسول اللہ مظلوم بھائی کی امداد تو ہم سمجھ گئے ۔ مگر ظالم کی امداد کا کیا مطلب ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو ۔ یہی اس کی امداد ہے ۔

قرآن کریم کی اس تعلیم نے بِرّ و تقویٰ یعنی نیکی اور خدا ترسی کو اصل معیار بنایا ۔ اسی پر مسلم قومیت کی تعمیر کھڑی کی ۔ اس پر تعاون و تناصر کی دعوت دی ۔ اس کے بالمقابل اِثم و

عُدْوَان کو سخت جرم قرار دیا ۔ اس پر تعاون کرنے سے روکا ۔ بِرّ و تقویٰ کے دو لفظ اختیار فرمائے ۔ جمہور مفسرین نے بِرّ کے معنی اس جگہ فعل الخیرات یعنی نیک عمل قرار دیئے ہیں اور تقویٰ کے معنی ترک المنکرات یعنی برائیوں کا ترک بتلائے ہیں ۔ اور لفظ اِثم مطلق گناہ اور معصیت کے معنی میں ہے ۔ خواہ وہ حقوق سے متعلق ہو یا عبادات سے اور عدوان کے لفظی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں ۔ مراد اس سے ظلم و جور ہے ۔

بِرّ و تقویٰ پر تعاون اور امداد کرنے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ۔ الدال علی الخیر کفاعلہ ۔ یعنی جو شخص کسی کو نیکی کا راستہ بتا دے تو اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے اس نیکی کو اس نے خود کیا ہو ۔ یہ حدیث ابن کثیر نے بحوالہ البزار نقل فرمائی ہے ۔ اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی طرف دعوت دے تو جتنے آدمی اس کی دعوت پر نیک عمل کریں گے، ان سب کی برابر اس کو بھی ثواب ملے گا ۔ بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم کیا جائے ۔ اور جس شخص نے لوگوں کو کسی گمراہی یا گناہ کی طرف بلایا ۔ تو جتنے لوگ اس کے بلانے سے گناہ میں مبتلا ہوئے ان سب کے گناہوں کی برابر اس کو بھی گناہ ہوگا ۔ بغیر اس کے کہ ان گناہوں میں کچھ کمی کی جائے ۔

اور ابن کثیر نے بروایت طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے چلا وہ اسلام سے نکل گیا ۔ اسی لئے اسلاف صالحین نے ظالم بادشاہوں کی ملازمت اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے سخت احتراز کیا ہے ۔ کہ اس میں ان کے ظلم کی امداد و اعانت ہے ۔ تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظالموں کے دوات، قلم کو درست کیا ہے ۔ وہ بھی سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کر کے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے ۔

یہ ہے قرآن و سنت کی وہ تعلیم جس نے دنیا میں نیکی ۔ انصاف ۔ ہمدردی ۔ اور خوش خلقی پھیلانے کے لئے ملت کے ہر فرد کو ایک داعی بنا کر کھڑا کر دیا تھا ۔ اور جرائم و ظلم و جور کے انسداد کے لئے ہر فرد ملت کو ایک ایسا سپاہی بنا دیا تھا جو خفیہ اور علانیہ اپنی ڈیوٹی بجا لانے پر خوف خدا تعالیٰ کی وجہ سے مجبور رہتا تھا ۔ اسی حکیمانہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا جو دنیا نے صحابہ و تابعین کے قرن میں دیکھا ۔ آج بھی جب کسی ملک میں

جنگ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو شہری دفاع کے محکمے قائم کر کے ہر فرد قوم کو کچھ فنون کی تعلیم کا تو اہتمام کیا جاتا ہے مگر جرائم کے انسداد کے لئے اس کا کہیں اہتمام نہیں ہے کہ لوگوں کو خیر کا داعی اور شر کو روکنے والا سپاہی بنانے کی کوشش کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اسکی مشق نہ فوجی پریڈ سے ہوتی ہے نہ شہری دفاع کے طریقوں سے۔ یہ ہنر تو تعلیم گاہوں میں سیکھنے سکھانے کا ہے جو آجکل بدقسمتی سے ان چیزوں کے نام سے ناآشنا ہے۔ برّ و تقویٰ اور ان کی تعلیمات کا داخلہ آجکل کی عام تعلیم گاہوں میں ممنوع ہے۔ اور اثم و عدوان کا ہر راستہ کھلا ہوا ہے۔ پھر یہ بیچاری پولیس کہاں تک جرائم کی روک تھام کرے۔ جب ساری قوم حلال و حرام اور حق و ناحق سے بیگانہ ہو کر جرائم پیشہ بن جائے۔ آج جو جرائم کی کثرت چوری، ڈاکہ، فواحش، قتل و غارت گری کی فراوانی ہر جگہ اور ہر ملک میں روز بروز زیادہ تر ہوتی جاتی ہے اور قانونی مشینری ان کے انسداد سے عاجز ہے۔

اس کے یہی دو سبب ہیں کہ ایک طرف تو حکومتیں اس قرآنی نظام سے دور ہیں، اُن کے ارباب اقتدار اپنی زندگی کو برّ و تقویٰ کے اصول پر ڈالتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ اگرچہ اسکے نتیجہ میں ہزاروں تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ کاش وہ اس تلخ گھونٹ کو ایک دفعہ تجربہ کے لئے ہی پی جائیں، اور خدا تعالیٰ کی قدرت کا تماشہ دیکھیں کہ کس طرح ان کو اور عوام کو امن و سکون اور چین و راحت کی حیات طیبہ عطا ہوتی ہے۔

دوسری طرف عوام نے یہ سمجھ لیا کہ انسداد جرائم صرف حکومت کا کام ہے۔ وہ ہر جرائم پیشہ کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ محض احقاق حق اور انسداد جرائم کے لئے سچی شہادت دینے کا رواج ہی ان میں نہ رہا۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ مجرم کے جرم پر پردہ ڈالنا اور شہادت سے گریز کرنا جرم کی اعانت ہے جو از روئے قرآن کریم حرام اور سخت گناہ ہے۔ اور وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے حکم سے بغاوت ہے۔

❖

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ

حرام ہوا تم پر مردہ جانور اور لہو اور گوشت سؤر کا اور جس

اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ

جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا اور گلا گھونٹے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر

وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۭ وَمَا ذُبِحَ

یا سینگ مارنے سے اور جس کو کھا یا ہو درندہ نے مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا اور حرام ہے جو ذبح

عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ

ہوا کسی تھان پر اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے یہ گناہ کا کام ہے

فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا

آج ناامید ہو گئے کافر تمہارے دین سے سو ان سے

تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ

مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو آج میں پورا کر چکا ہوں تمہارے لئے دین تمہارا اور

اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ

پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ

پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں لیکن گناہ پر مائل نہ ہو

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳

تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر

تم پر (یہ جانور وغیرہ) حرام کئے گئے ہیں مردار (جانور جو کہ باوجود واجب الذبح ہونے کے بلاوجہ شرعی مرجاوے) اور خون (جو بہتا ہو) اور خنزیر کا گوشت (اسی طرح اس کے سب اجزاء) اور جو جانور کہ (بقصد قربت) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرجاوے اور جو کسی ضرب سے مرجاوے اور جو اونچے سے گر کر مرجاوے (مثلاً پہاڑ سے یا کنوئیں میں) اور جو کسی کی ٹکر سے مرجاوے اور جس کو کوئی درندہ (پکڑ کر) کھانے لگے (اور اس کے صدمہ سے مرجاوے) لیکن (منخنقہ سے ما اکل السبع تک جن کا ذکر ہے ان میں سے) جس کو تم (دم نکلنے سے پہلے قاعدہ شرعیہ کے مطابق) ذبح کر ڈالو (وہ اس حرمت سے مستثنیٰ ہے)۔ اور (نیز) جو جانور (غیر اللہ کی) پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے (حرام ہے گو زبان سے غیر اللہ کے نامزد نہ کرے۔ کیونکہ مدار حرمت کا نیت تجیئہ پر ہے۔ اس کا ظہور کبھی قول سے ہوتا ہے کہ نامزد کرے کبھی فعل سے ہوتا ہے کہ ایسے مقامات پر ذبح کرے) اور یہ (بھی حرام ہے) کہ (گوشت وغیرہ) تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کے یہ سب گناہ (اور حرام) ہیں آج کے دن (یعنی اب) ناامید ہو گئے کافر لوگ تمہارے دین (کے مغلوب و گم ہو جانے) سے (کیونکہ ماشاء اللہ اسلام کا خوب شیوع ہو گیا) سو ان (کفار) سے مت ڈرنا کہ تمہارے دین کو گم کر سکیں) اور مجھ سے ڈرتے رہنا (یعنی میرے احکام کی مخالفت مت کرنا) آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا (قوت میں بھی جس سے کفار کو

مایوسی ہوئی اور احکام و قواعد میں بھی) اور (اس اکمال سے) میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا (دینی انعام بھی کہ احکام کی تکمیل ہوئی اور دنیوی انعام بھی کہ قوت حاصل ہوئی اور اکمال دین میں دونوں آگئے) اور میں نے اسلام کو تمھارا دین بننے کے لئے (ہمیشہ کو) پسند کر لیا (یعنی قیامت تک تمھارا یہی دین رہے گا۔ اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین تجویز نہ کیا جاوے گا۔ پس تم کو چاہیئے کہ میری نعمت کا شکر کر کے اس دین پر پورے پورے قائم رہو) پھر (اشیائے مذکورہ بالا کی حرمت دریافت کر لینے کے بعد یہ بھی معلوم کر لو کہ) جو شخص شدت کی بھوک میں بیتاب ہو جاوے (اور اس وجہ سے اشیائے بالا کو کھالے) بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو (یعنی نہ قدر ضرورت سے زیادہ کھاوے اور نہ لذت مقصود ہو جس کو سورۂ بقرہ میں غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے تعبیر فرمایا ہے) تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں (اگر قدر ضرورت کا پورا اندازہ نہ ہوا اور ایک آدھ لقمہ زیادہ بھی کھا گیا) اور بڑی رحمت والے ہیں (کہ ایسی حالت میں اجازت دے دی)۔

مَعارف و مَسائِل

یہ سورۂ مائدہ کی تیسری آیت ہے۔ جس میں بہت سے اصول اور فروعی احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا مسئلہ حلال و حرام جانوروں کا ہے۔ جن جانوروں کا گوشت انسان کے لئے مضر ہے، خواہ جسمانی طور پر کہ اس سے انسان کے بدن میں بیماری کا خطرہ ہے، یا روحانی طور پر کہ اس سے انسان کے اخلاق اور قلبی کیفیات خراب ہونے کا خطرہ ہے۔ ان کو قرآن نے خبائث قرار دیا اور حرام کر دیا، اور جن جانوروں میں کوئی جسمانی یا روحانی مضرت نہیں ہے، ان کو طیب اور حلال قرار دیا۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ حرام کئے گئے تم پر مُردار جانور۔ مُردار سے مُراد وہ جانور ہیں جو بغیر ذبح کے کسی بیماری کے سبب یا طبعی موت سے مر جائیں۔ ایسے مُردار جانور کا گوشت "طبّی" طور پر بھی انسان کے لئے سخت مضر ہے اور روحانی طور پر بھی۔

البتہ حدیث شریف میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ایک "مچھلی" دوسرے ٹِڈی۔ یہ حدیث مسند احمد، ابن ماجہ، دار قطنی، بیہقی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

دوسری چیز جس کو اس آیت نے حرام قرار دیا ہے وہ خون ہے، اور قرآن کریم کی دوسری آیت میں اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا فرما کر یہ بتلا دیا گیا کہ خون سے مراد بہنے والا خون ہے

اس لئے جگر اور تلی باوجود خون ہونے کے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ حدیث مذکور میں جہاں "میتہ" سے مچھلی اور ٹِڈی کو مستثنیٰ فرمایا ہے۔ اسی میں جگر اور طحال کو خون سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

تیسری چیز "لحم خنزیر" ہے۔ جس کو حرام فرمایا ہے۔ لحم سے مراد اس کا پورا بدن ہے۔ جس میں چربی، پٹھے وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔

چوتھے وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر اگر ذبح کے وقت بھی اسی پر غیر اللہ کا نام لیا ہے تو وہ کھُلا شرک ہے۔ اور یہ جانور باتفاق مردار کے حکم میں ہے۔

جیسا کہ مشرکین عرب اپنے بتوں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے۔ یا بعض جاہل کسی پیر فقیر کے نام پر، اور اگر بوقت ذبح نام تو اللہ تعالیٰ کا لیا، مگر جانور کسی غیر اللہ کے نام پر نذر کیا ہو اور اس کی رضامندی کے لئے قربان کیا ہے تو جمہور فقہاء نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ، کے تحت حرام قرار دیا ہے۔

پانچویں۔ مُنْخَنِقَة یعنی وہ جانور حرام ہے جو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہو یا خود ہی کسی جال وغیرہ میں پھنس کر دم گھٹ گیا ہو۔ اگرچہ منخنقۃ، اور مو[illegible] بھی میتۃ کے اندر داخل ہیں، مگر اہل جاہلیت ان کو جائز سمجھتے تھے۔ اس لئے خصوصی ذکر کیا گیا۔

چھٹے۔ موقوذۃ، یعنی وہ جانور جو ضرب شدید کے ذریعہ ہلاک ہوا ہو۔ جیسے لاٹھی یا پتھر وغیرہ سے مارا گیا ہو۔ اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل کر دے کہ دھار کی طرف سے نہ لگے ویسے ہی ضرب سے مر جائے وہ بھی موقوذۃ میں داخل ہو کر حرام ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات "معراض" تیر سے شکار کرتا ہوں۔ اگر شکار اس سے مر جائے تو کیا کھا سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ جانور عرضی تیر کی چوٹ سے مرا ہے تو وہ موقوذۃ میں داخل ہے اس کو مت کھا اور اگر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کر دیا ہے تو کھا سکتے ہو۔ یہ روایت جصاص نے "احکام القرآن" میں اپنی اسناد سے نقل کی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ تیر پھینکنے کے وقت بسم اللہ کہہ کر پھینکا گیا ہو۔

جو شکار بندوق کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ اس کو بھی فقہاء نے موقوذۃ میں داخل اور حرام قرار دیا ہے۔ امام جصاصؒ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے۔ المقتولة بالبندقة تلك الموقوذة۔ یعنی بندوق کے ذریعہ جو جانور قتل کیا گیا ہے وہ ہی موقوذہ ہے اس لئے حرام ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ، شافعی، مالک وغیرہ سب اس پر متفق ہیں۔ (قرطبی) ساتویں مُتَرَدِّيَة۔ یعنی وہ جانور جو کسی پہاڑ، ٹیلہ یا اونچی

عمارت یا کنوئیں وغیرہ میں گر کر مر جائے وہ بھی حرام ہے۔ اسی لئے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شکار پہاڑ پر کھڑا ہے، اور تم نے تیر بسم اللہ پڑھ کر اس پر پھینکا اور وہ تیر کی زد سے نیچے گر کر مر گیا تو اس کو نہ کھاؤ۔

کیونکہ اس میں بھی احتمال ہے کہ اس کی موت تیر کی زد سے نہ ہو گرنے کے صدمہ سے ہو تو وہ مُتَرَدِّیَہ میں داخل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی پرندہ پر تیر پھینکا، وہ پانی میں گر گیا تو اس کے کھانے کو بھی اسی بنا پر منع فرمایا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کی موت ڈوبنے سے واقع ہوئی ہو (جصاص)۔

اور حضرت عدی بن حاتم رضؓ نے یہی مضمون رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت فرمایا ہے۔ (جصاص)۔

آٹھویں۔ نَطِیْحَہ۔ یعنی وہ جانور جو کسی ٹکر اور تصادم سے ہلاک ہو گیا ہو۔ جیسے ریل، موٹر وغیرہ کی زد میں آکر مر جائے یا کسی دوسرے جانور کی ٹکر سے مر جائے۔

نویں۔ وہ جانور جس کو کسی درندہ جانور نے پھاڑ دیا ہو اس سے مر گیا ہو۔

اِن نو اقسام کی حرمت بیان فرمانے کے بعد ایک استثناء ذکر کیا گیا۔ فرمایا۔۔۔ ۔۔۔۔ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ۔ یعنی اگر اِن جانوروں میں سے تم نے کسی کو زندہ پالیا اور ذبح کر لیا تو وہ حلال ہو گیا۔ اس کا کھانا جائز ہے۔

یہ استثناء شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مَیْتَۃ اور دَم میں تو اس کا امکان ہی نہیں۔ اور خنزیر اور مَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ۔ اپنی ذات سے حرام ہیں، ذبح کرنا نہ کرنا اُن میں برابر ہے۔ اسی لئے حضرت علی رضؓ۔ ابن عباس رضؓ، حسن بصری۔ قتادہ۔ وغیرہ سلف صالحین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ استثناء ابتدائی چار کے بعد یعنی مُنْخَنِقَہ اور اس کے مابعد سے متعلق ہے۔ اس لئے مطلب اس کا یہ ہو گیا کہ ان تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا، زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے۔ خواہ وہ مُنْخَنِقَہ ہو، یا مَوْقُوْذَہ یا مُتَرَدِّیَہ اور نَطِیْحَہ یا جس کو درندہ نے پھاڑ ڈالا ہے۔ اِن میں سے جس کو بھی آثار زندگی محسوس کرتے ہوئے ذبح کر لیا وہ حلال ہو گیا۔

دسویں۔ وہ جانور حرام ہے جو نُصُب پر ذبح کیا گیا ہو۔ نُصُب وہ پتھر ہیں جو کعبہ کے گرد کھڑے کئے ہوئے تھے۔ اور اہل جاہلیت ان کی پرستش کرتے اور ان کے پاس لا کر جانوروں کی قربانی ان کے لئے کرتے تھے۔ اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔

اہل جاہلیت اِن سب قسم کے جانوروں کو کھانے کے عادی تھے جو خبائث میں داخل ہیں۔ قرآن کریم نے ان سب کو حرام قرار دیا۔

گیارھویں چیز جس کو اس آیت میں حرام قرار دیا ہے۔ وہ استقسام بالازلام ہے ازلام، زلم کی جمع ہے۔ زلم اس تیر کو کہتے ہیں جو جاہلیت عرب میں اس کام کے لئے مقرر تھا کہ اس کے ذریعہ قسمت آزمائی کی جاتی تھی اور یہ سات تیر تھے۔ جن میں سے ایک پر نعم ایک پر لآ۔ اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ لکھے ہوتے تھے۔ اور یہ تیر بیت اللہ کے خادم کے پاس رہتے تھے۔

جب کسی شخص کو اپنی قسمت یا آئندہ کسی کام کا مفید ہونا یا مضر ہونا معلوم کرنا ہوتا، تو خادم کعبہ کے پاس جاتے اور سَو روپے اس کو نذرانہ دیتے وہ اِن تیروں کو ترکش سے ایک ایک کر کے نکالتا۔ اگر اس پر لفظ نعم نکل آیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام مفید ہے، اور اگر لآ نکل آیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہ کرنا چاہیئے۔ حرام جانوروں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے، کہ عرب کی یہ بھی عادت تھی کہ چند آدمی شریک ہو کر کوئی اونٹ وغیرہ ذبح کرتے مگر گوشت کی تقسیم ہر ایک کے حصہ شرکت کے مطابق کرنے کے بجائے ان جُوئے کے تیروں سے کرتے تھے۔ جس میں کوئی بالکل محروم رہتا، کسی کو بہت زیادہ، کسی کو حق سے کم ملتا تھا۔ اس لئے جانوروں کی حرمت کے ساتھ اس طریقہ کار کی حرمت کا بیان کر دیا گیا۔

علماء نے فرمایا کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں، خواہ اہل جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے استقسام بالازلام کے حکم میں ہیں۔

اور استقسام بالازلام کا لفظ کبھی قمار یعنی جوئے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جس میں قرعہ اندازی یا لاٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جائے۔ یہ بھی بنص قرآن حرام ہے۔ جس کو قرآن کریم نے مَیْسِر کے نام سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی لئے حضرت سعید بن جبیرؒ، مجاہدؒ، اور شعبیؒ نے فرمایا کہ جس طرح عرب ازلام کے ذریعہ حصے نکالتے اسی طرح فارس و روم میں شطرنج، چوسر وغیرہ کے مہروں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ ازلام کے حکم میں ہیں۔ (مظہری)

استقسام بالازلام کی حرمت کے ساتھ ارشاد فرمایا۔

ذٰلِکُمْ فِسْقٌ۔ یعنی یہ طریقہ قسمت معلوم کرنے یا حصہ مقرر کرنے کا فسق اور

گمراہی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ	آج کے دن کفار تمہارے دین پر غالب آنے سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اس لئے اب تم اُن سے کوئی خوف نہ رکھو البتہ مجھ سے ڈرتے رہو۔

یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے یوم عرفہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ جبکہ مکہ اور تقریباً سارا عرب فتح ہو چکا تھا۔ پورے جزیرۃ العرب پر اسلامی قانون جاری تھا۔ اس پر فرمایا کہ اب سے پہلے جو کفار یہ منصوبے بنایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی جماعت ہمارے مقابلہ میں کم بھی ہے اور کمزور بھی ان کو ختم کر دیا جائے۔ اب نہ اُن میں یہ حوصلے باقی رہے، نہ ان کی وہ طاقت رہی۔ اس لئے مسلمان اُن سے مطمئن ہو کر اپنے رب کی اطاعت وعبادت میں لگ جائیں۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے، عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں سید الایام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا۔ جس کے فضائل معروف ہیں۔ مقام میدانِ عرفات کا جبل رحمت کے قریب ہے، جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ رحمت کا خاص مقام ہے۔ وقت عصر کے بعد کا ہے، جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے۔ اور خصوصاً یوم جمعہ میں کہ قبولیتِ دعا کی گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے اور عرفہ کے روز اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔

حج کے لئے مسلمانوں کا سب سے بڑا پہلا عظیم اجتماع ہے۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابۂ کرام رضؓ شریک ہیں۔ رحمۃ للعالمین صحابۂ کرام رضؓ کے ساتھ جبلِ رحمت کے نیچے اپنی ناقہ "عضباء" پر سوار ہیں۔ اور حج کے اُس بڑے رکن یعنی وقوفِ عرفات میں مشغول ہیں۔

اِن فضائل وبرکات اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیتِ کریمہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔ صحابۂ کرام کا بیان ہے کہ جب آپ پر یہ آیت بذریعہ وحی نازل ہوئی تو حسبِ دستور وحی کا ثقل اور بوجھ اتنا محسوس ہوا کہ اونٹنی اس سے دبی جا رہی تھی یہاں تک کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن کی آخری آیت

ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت احکام سے متعلق نازل نہیں ہوئی، صرف ترغیب وترہیب کی چند آیتیں ہیں۔ جن کا نزول اس آیت کے بعد بتلایا گیا ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں صرف اکیاسی روز بقیدِ حیات رہے، کیونکہ سنہ ۱۰ھ ہجری کی نویں ذی الحجہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور سنہ ۱۱ھ ہجری کی ...... بارھویں[1] ربیع الاول کو آنحضرت صلی اللہ علیہ کی وفات ہو گئی۔

یہ آیت جو اس خاص شان اور اہتمام سے نازل ہوئی اس کا مفہوم بھی ملتِ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری اور بھاری انعام اور اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ حق اور نعمتِ الٰہی کا انتہائی معیار جو اس عالم میں بنی نوعِ انسان کو عطا ہونے والا تھا، آج وہ مکمل کر دیا گیا۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے جو دینِ حق اور نعمتِ الٰہیہ کا نزول اور ترویج شروع کی گئی تھی اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مناسبِ حال اس نعمت کا ایک حصہ اولادِ آدم کو عطا ہوتا رہا آج وہ دین اور نعمت مکمل صورت میں خاتم الانبیاء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کو عطا کر دی گئی۔

اس میں تمام انبیاء ورسل کے زمرہ میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت اور امتیازی شان کا تو اظہار ہے ہی اس کے ساتھ تمام امتوں کے مقابلہ میں امتِ مرحومہ کی بھی ایک خاص امتیازی شان کا واضح ثبوت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ چند علماء یہود حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تمہارے قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر یہود پر نازل ہوتی تو وہ اس کے نزول کا ایک جشنِ عید مناتے۔ فاروق اعظم رضؓ نے سوال کیا کہ وہ کونسی آیت ہے۔ انھوں نے یہی آیت - اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ پڑھ دی۔

حضرت فاروق اعظم رضؓ نے اُن کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ اور کس دن نازل ہوئی۔ اشارہ اسی بات کی طرف تھا کہ وہ دن ہمارے لئے دوہری عید کا دن تھا ایک عرفہ دوسرے جمعہ۔

عید اور تہوار منانے کا اسلامی اصول

فاروق اعظم رضؓ کے اس جواب میں ایک اسلامی اصول کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو تمام دنیا کی

[1] یہ مشہور قول کی بنا پر لکھ دیا گیا ہے، ورنہ خود حضرت مؤلف قدس سرہ نے اپنے رسالہ سیرت خاتم الانبیاء ص ۱۲۲ پر حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ مغلطائی کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات دوسری ربیع الاول کو صحیح قرار دیا ہے، اور اکیاسی روز اسی حساب سے بنتے ہیں۔

میں ہوں گے ۔ اگر یادگاری دن منائے جائیں تو آن کو چھوڑ دینا کیا ان کے حق میں بے انصافی اور قدر ناشناسی نہیں ہوگی ۔ اور اگر یہ طے کر لیا جائے کہ سبھی کے یادگاری دن منائے جائیں تو سال بھر میں ایک دن بھی ہمارا یادگار منانے سے خالی نہیں رہے ۔ بلکہ ہر دن کے ہر گھنٹہ میں کئی کئی یادگاریں اور کئی کئی عیدیں منانی پڑیں گی ۔

یہی وجہ ہے کہ " رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم " اور صحابہ کرام رضؓ نے اس رسم کو جاہلیت کی رسم قرار دے کر نظر انداز کیا ہے ...... حضرت فاروق اعظم رضؓ کے اِس فرمان میں اسی کی طرف اشارہ ہے ۔

اب اس آیت کے معنیٰ ومطالب کی تفصیل سنئے ۔ اس میں حق تعالیٰ شانہٗ نے رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امتِ مرحومہ کو تین خصوصی انعام عطا فرمانے کی بشارت دی ہے ۔ ایک اکمالِ دین ، دوسرے اتمامِ نعمت ، تیسرے شریعت اسلام کا اس اُمت کے لئے انتخاب ۔

اکمالِ دین کے معنیٰ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ وغیرہ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ آج دینِ حق کے تمام حدُود وفرائض اور احکام وآداب مکمّل کر دیے گئے ہیں ۔ اب اس میں نہ کسی اضافہ اور زیادتی کی ضرورت باقی ہے اور نہ کمی کا احتمال (روح) ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد احکامِ اسلام میں سے کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا جو چند آیتیں اس کے بعد نازل ہوئیں ، ان میں یا تو ترغیب وترہیب کے مضامین ہیں ، اور یا اُنھیں احکام کی تاکید جن کا بیان پہلے ہو چکا تھا ۔

اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ اصول واجتہاد کے ماتحت ائمہ مجتہدین نئے نئے پیش آنے والے واقعات وحالات کے متعلق اپنے اجتہاد سے احکام شرعیہ بیان کریں کیونکہ قرآن کریم نے جس طرح احکام شرعیہ کے حدود وفرائض وغیرہ بیان فرمائے ہیں اسی طرح اصول اجتہاد بھی قرآن ہی نے متعیّن فرما دیے ہیں ۔ ان کے ذریعہ جو احکام قیامت تک نکالے جائیں وہ سب ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کئے ہوئے احکام ہیں ۔ کیونکہ ان اصول کے ماتحت ہیں جو قرآن نے بیان کئے ۔

خُلاصہ یہ ہے کہ اکمالِ دین کا مطلب ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ دین کے تمام احکام کو مکمل کر دیا گیا ۔ اب نہ اس میں کسی زیادتی کی ضرورت باقی ہے نہ منسوخ ہو کر کمی کا احتمال ۔ کیونکہ اس کے بعد ہی متصل سلسلۂ وحی وفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منقطع ہونے والا تھا اور بغیر وحی الٰہی کے

قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا ۔ اور جو بظاہر زیادتی احکام کی اصول اجتہاد کے تحت فقہاء ومجتہدین کی طرف سے ہوئی ۔ وہ درحقیقت زیادتی نہیں بلکہ احکامِ قرآنی کی توضیح وبیان ہے ۔

اور اتمام نعمت سے مُراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج اور ان کے مخالفین کا مغلوب ومفتوح ہونا ہے ، جس کا ظہور مکہ مکرمہ کی فتح اور رسوم جاہلیت کے مٹانے سے اور اس سال حج میں کسی مُشرک کے شریک نہ ہونے کے ذریعہ ہوا ۔

یہاں الفاظِ قرآن میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ دین کے ساتھ لفظِ اکمال استعمال فرمایا گیا اور نعمت کے ساتھ لفظِ اتمام ، حالانکہ یہ دونوں لفظ بظاہر ایک دوسرے کے ہم معنٰی اور مُرادف سمجھے جاتے ہیں ۔

لیکن درحقیقت اِن دونوں کے مفہوم میں ایک فرق ہے جس کو مفردات القرآن میں امام راغب اصفہانی رحؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ کسی چیز کا " اکمال اور تکمیل " اس کو کہتے ہیں کہ اُس چیز سے جو غرض اور مقصود تھا وہ پُورا ہو گیا ۔ اور لفظِ اتمام کے معنیٰ یہ ہیں کہ اب دوسری چیز کی ضرورت اور حاجت نہیں رہی ۔ اس لئے " اکمالِ دین " کا حاصل یہ ہوا کہ قانونِ الٰہی اور احکامِ دین کے اس دنیا میں بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ آج پُورا کر دیا گیا ۔ اور اتمامِ نعمت کا مطلب یہ ہوا کہ اَب مسلمان کسی کے محتاج نہیں ۔ ان کو خود حق تعالیٰ جل شانہٗ نے غلبہ ، قوّت اور اقتدار عطا فرما دیا جس کے ذریعہ وہ اس دینِ حق کے احکام کو جاری اور نافذ کر سکیں ۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں دین کی نسبت تو مسلمانوں کی طرف فرمائی گئی ہے اور نعمت کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ، وجہ یہ ہے کہ دین کا ظہور اُن اعمال وافعال کے ذریعہ ہوتا ہے جو اُمّت کے افراد کرتے ہیں اور نعمت کی تکمیل براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے ہے ۔ (ابن قیم ، تفسیر القیم) ۔

اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اکمالِ دین آج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا دین ناقص تھا ۔ بلکہ جیسا تفسیر بحر محیط میں بحوالہ قفال مروزی رحمۃ اللہ علیہ ... نقل کیا ہے کہ دین تو ہر نبی ورسول کا اُس کے زمانہ کے اعتبار سے کامل ومکمل تھا ۔ یعنی جس زمانہ میں جس پیغمبر پر کوئی شریعت ودینِ اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا اُس زمانہ اور اُس قوم کے لحاظ سے وہی کامل ومکمل تھا ۔ لیکن اللہ جلِ شانہٗ کے علم میں یہ تفصیل پہلے سے تھی کہ جو دین اس زمانہ اور اس قوم کے لئے مکمل ہے وہ اگلے زمانہ اور آنے والی

قوموں کے لیے مکمل نہ ہوگا، بلکہ اس کو منسوخ کرکے دوسرا دین و شریعت نافذ کی جائے گی۔ بخلاف شریعت اسلام کے جو سب سے آخر میں نازل کی گئی کہ وہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے۔ نہ وہ کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی خاص خطہ، ملک یا قوم کے ساتھ۔ بلکہ قیامت تک ہر زمانہ اور ہر خطہ اور ہر قوم کے لیے یہ شریعت کامل و مکمل ہے۔

تیسرا انعام جو اس اُمت مرحومہ کے لیے اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس اُمت کے لیے اللہ جل شانہٗ نے اپنے تکوینی انتخاب کے ذریعہ دینِ اسلام کو منتخب فرمایا جو ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے۔ اور جس پر نجات کا انحصار ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت نے یہ بتلا دیا کہ اُمتِ مرحومہ کے لیے دینِ اسلام ایک بڑی نعمت ہے جو ان کو بخشی گئی ہے۔ اور یہی دین ہے جو ہر حیثیت اور ہر جہت سے کامل و مکمل ہے، نہ اس کے بعد کوئی نیا دین آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جائے گی۔

یہی وجہ تھی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سُن کر خوش ہو رہے تھے مگر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن سے رونے کی وجہ پوچھی تو عرض کیا کہ اس آیت سے اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے۔ کیونکہ تکمیل کے ساتھ ارسالِ رسول کی ضرورت بھی پوری ہو چکی ـــ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر و بحرِ محیط وغیرہ) چنانچہ آنے والے وقت نے بتلا دیا کہ اس کے صرف اکیاسی روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

آخر آیت میں فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ کا تعلق اُن جانوروں سے ہے، جن کی حرمت کا بیان شروع آیت میں آیا ہے۔ اور اس جُملہ کا مطلب ایک خاص حالت کو عام قاعدہ سے مستثنیٰ کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جاوے اور خطرہ موت کا لاحق ہو جائے۔ ایسی حالت میں اگر وہ مذکورہ بالا حرام جانوروں میں سے کچھ کھالے تو اس کے لیے گناہ نہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ پیٹ بھرنا اور لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ صرف اتنا کھالے جس سے اضطرار کی کیفیت رفع ہو جاوے۔

آیت میں غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ کا یہی مطلب ہے کہ اس کھانے میں اُسکا میلان گناہ کی طرف نہ ہو بلکہ صرف اضطرار کا رفع کرنا ہو ـــ آخر میں فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ سے اِس طرف اشارہ ہے کہ یہ محرمات اس وقت بھی اپنی جگہ حرام

دنا جائز ہی ہیں، صرف اس شخص کو اضطرار کی وجہ سے معاف کر دیا گیا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز اُن کے لیے حلال ہے کہہ دے تم کو حلال ہیں ستھری چیزیں

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ

اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو کہ ان کو سکھاتے اس میں سے جو

مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ

اللہ نے تم کو سکھایا ہے سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے

وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اور اللہ کا نام لو اس پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ جلد

سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

لینے والا ہے حساب

ربطِ آیات پہلی آیات میں حلال و حرام جانوروں کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اسی معاملہ کے متعلق ایک سوال کا جواب ہے۔ بعض صحابہ کرام نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شکاری کُتّے اور باز سے شکار کرنے کا حکم دریافت کیا تھا، اس آیت میں اس کا جواب مذکور ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (کتّے اور باز کے شکار کیے ہوئے جانوروں میں سے) کیا کیا چیزیں اُن کے لیے حلال کی گئی ہیں (یعنی جتنے حلال شکار ذبح سے حلال ہو جاتے ہیں۔ کیا کُتّے اور باز کے شکار کرنے سے وہ سب حلال رہتے ہیں یا اُن میں سے کچھ مخصوص جانور حلال ہوتے ہیں یا مطلقاً کوئی حلال نہیں ہوتا اور جو حلال ہوتے ہیں تو کیا اس کیلئے کچھ شرط بھی ہے) آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ تمہارے لئے کل حلال جانور (جو از قسم شکار پہلے سے حلال ہیں، وہ سب کتّے اور باز کے ذریعہ شکار کرنے سے بھی) حلال رکھے گئے ہیں (یہ سوال کے پہلے جز کا جواب ہے، آگے دوسرے جز کا جواب یہ ہے کہ کتّے اور باز کے شکار حلال ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں وہ کہ) جن شکاری جانوروں کو (مثلاً کتّا، باز وغیرہ) تم (خاص طور پر جس کا بیان آگے آتا ہے) تعلیم دو (یہ ایک شرط ہے)

اور تم اُن کو (شکار پر) چھوڑو بھی۔ (یہ دوسری شرط ہے) اور ان کو (جو تعلیم دینا اوپر ذکر کیا گیا ہے) اس طریقہ سے تعلیم دو جو تم کو اللہ نے (شریعت میں) تعلیم دیا ہے (وہ طریقہ یہ ہے کہ کتے کو تو یہ تعلیم دی جائے کہ شکار پکڑ کر کھاوے نہیں، اور باز کو یہ تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ اگرچہ وہ شکار کے پیچھے جا رہا ہو فوراً واپس آجائے یہ شرط اول کا بیان ہے) تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمھارے لئے پکڑیں اس کو کھالو۔ (یہ تیسری شرط ہے جس کی علامت طریقۂ تعلیم میں بیان ہو چکی ہے، سو اگر کتا اس شکار کو کھانے لگے یا باز بلانے سے واپس نہ آئے تو سمجھا جائے گا کہ جب یہ جانور اُس کے کہنے میں نہیں تو انھوں نے شکار بھی اس کے لئے نہیں پکڑا بلکہ خود اپنے لئے پکڑا ہے) اور (جب شکار پر اس شکاری جانور کو چھوڑنے لگو تو) اُس (جانور) پر (یعنی اس کے چھوڑنے کے وقت) اللہ کا نام بھی لیا کرو۔ (یعنی بسم اللہ پڑھ کر چھوڑو۔ یہ چوتھی شرط ہے) اور (تمام اُمور میں) اللہ سے ڈرتے رہا کرو (مثلاً شکار میں ایسے منہمک مت ہو کہ نماز وغیرہ سے غفلت ہو جاوے یا اتنی حرص مت کرو کہ شرائط حلت کے بغیر بھی اس جانور کو کھا جاؤ) بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر جواب و سوال میں شکاری کتے اور باز وغیرہ کے ذریعہ شکار حلال ہونے کے لئے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں:-

اوّل یہ کہ کتا یا باز سکھایا اور سدھایا ہوا ہو اور سکھانے سدھانے کا یہ اصول قرار دیا ہے کہ جب تم کتے کو شکار پر چھوڑو تو وہ شکار پکڑ کر تمھارے پاس لے آئے۔ خود اُس کو کھانے نہ لگے۔ اور باز کے لئے یہ اصول مقرر کیا کہ جب تم اس کو واپس بلاؤ تو وہ فوراً آجائے اگرچہ وہ شکار کے پیچھے جا رہا ہو۔ جب یہ شکاری جانور ایسے سدھ جائیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ وہ جو شکار کرتے ہیں تمھارے لئے کرتے ہیں اپنے لئے نہیں، اب ان شکاری جانوروں کا شکار خود تمھارا شکار سمجھا جائے گا۔ اور اگر کسی وقت وہ اس تعلیم کے خلاف کریں مثلاً کتا خود شکار کو کھانے لگے یا باز تمھارے بُلانے پر واپس نہ آئے تو یہ شکار تمھارا نہیں رہا۔ اسلئے اس کا کھانا جائز نہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ تم فوراً اپنے ارادہ سے کتے کو یا باز کو شکار کے پیچھے چھوڑ دو یہ نہ ہو کہ وہ خود بخود کسی شکار کے پیچھے دوڑ کر اس کو شکار کر لیں۔ آیت مذکورہ میں اس شرط کا

بیان لفظ مُکَلِّبِیْن سے کیا گیا ہے۔ یہ لفظ دراصل تکلیب سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنے کتوں کو سکھلانے کے ہیں۔ پھر عام شکاری جانوروں کو سکھلانے اور شکار پر چھوڑنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ صاحب جلالین اس جگہ مکلبین کی تفسیر ارسال سے کرتے ہیں جس کے معنی ہیں شکار پر چھوڑنا۔ اور تفسیر قرطبی میں بھی یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ شکاری جانور شکار کو خود نہ کھانے لگیں بلکہ تمھارے پاس لے آئیں۔ اس شرط کا بیان مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ سے ہوا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ جب شکاری کتے یا باز کو شکار پر چھوڑو تو بسم اللہ کہہ کر چھوڑو جب یہ چاروں شرطیں پوری ہوں تو اگر جانور تمھارے پاس آنے تک دم توڑ چکا ہو تو بھی حلال ہے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ بغیر ذبح کے تمھارے لئے حلال نہ ہوگا۔

امام اعظم ابوحنیفہ رح کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ یہ شکاری جانور شکار کو زخمی بھی کر دے۔ اس شرط کی طرف لفظ جَوَارِح میں اشارہ موجود ہے۔

مسئلہ: یہ حکم اُن وحشی جانوروں کا ہے جو اپنے قبضہ میں نہ ہوں، اور اگر کسی وحشی جانور کو اپنے قابو میں کر لیا گیا ہے تو وہ بغیر باقاعدہ ذبح کے حلال نہیں ہوگا۔

آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ شکار جانور کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حلال تو کر دیا ہے، مگر شکار کے پیچھے لگ کے نماز اور ضروری احکام شرعیہ سے غفلت برتنا جائز نہیں ؕ

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

آج حلال ہوئیں تم کو سب ستھری چیزیں اور اہل کتاب کا کھانا تم کو

حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ

حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کو حلال ہے اور حلال ہیں تم کو پاک دامن

الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

عورتیں مسلمان اور پاک دامن عورتیں اُن میں سے جن کو دی گئی کتاب

مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ

تم سے پہلے جب دو ان کو مہر ان کے قید میں لانے کو

غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ

نہ مستی نکالنے کو اور نہ چھپی آشنائی کرنے کو اور جو منکر ہوا

بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۵﴾ ع ۵

ایمان سے تو ضائع ہوئی محنت اسکی اور آخرت میں وہ ٹوٹے والوں میں ہے

خُلاصۂ تفسیر

آج (تم پر جیسے دینی اَبدی انعام ہوا کہ اکمالِ دین سے مشرف کئے گئے۔ اسی طرح ایک معتدبہ دنیوی ابدی انعام بھی ہوا کہ) تمہارے لئے حلال چیزیں (کہ اس سے پہلے حلال کردی گئی تھیں ہمیشہ کے لئے) حلال رکھی گئیں (کہ کبھی منسوخ نہ ہوں گی) اور جو لوگ (تم سے پہلے آسمانی) کتاب دئے گئے ہیں (یعنی یہود و نصارٰی) ان کا ذبیحہ (بھی) تم کو حلال ہے اور (اس کا حلال ہونا ایسا ہی یقینی ہے جیسا) تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں (تم کو حلال ہیں) اور (جیسا مسلمان عورتوں کا حلال ہونا یقینی ہے اسی طرح) پارسا عورتیں اُن لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) دئے گئے ہیں (تم کو حلال ہیں) جب تم ان کو ان کا معاوضہ دے دو (یعنی مہر دینا گو شرط نہیں مگر واجب ہے اور عورتیں مذکورہ جو حلال کی گئی ہیں تو) اس طرح سے کہ تم (ان کو) بیوی بنا ؤ۔ (یعنی نکاح میں لاؤ جن کی شرطیں شرع میں معلوم ہیں) نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو (یہ سب احکام شرعیہ ہیں جن پر ایمان لانا فرض ہے) اور جو شخص ایمان (لانے کی چیزوں) کے ساتھ کفر کرے گا (مثلاً حلال قطعی کی حلت کا یا حرام قطعی کی حرمت کا انکار کرے گا) تو اس شخص کا (ہر نیک) عمل غارت (اور اکارت) جاوے گا اور وہ شخص آخرت میں بالکل زیاں کار ہوگا۔ (بس حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو)۔

مَعارِف و مَسائِل

سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں بہیمۃ الانعام یعنی پالتو جانور، بکری، گائے، بھینس وغیرہ کا حلال ہونا بیان فرمایا گیا ہے اور تیسری آیت میں نو قسم کے حرام جانوروں کی تفصیل ہے مگر اس تفصیل سے اس کے ابتدائی جملہ میں اس پورے باب کا خلاصہ اس طرح بیان فرمادیا ہے کہ اس میں جانوروں کی حِلّت و حرمت کا ضابطہ بھی معلوم ہوگیا۔ اور اس کا ایک معیار و اصول بھی۔

ارشاد ہے، اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ یعنی آج تمہارے لئے حلال ہوئیں

سب صاف ستھری چیزیں۔ آج سے مُراد وُہ دن ہے جس میں یہ آیت اور اس سے پہلی آیات نازل ہوئی ہیں۔ یعنی حجۃ الوداع سنہ ۱۰ھ کا یوم عرفہ۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے آج تمہارے لئے دین کامل مکمل کردیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت تم پر مکمل ہوگئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ چیزیں جو پہلے بھی تمہارے لئے حلال تھیں، دائمی طور پر حلال رکھی گئیں۔ اور ان کے منسوخ ہونے کا احتمال ختم ہوا۔ کیونکہ سلسلۂ وحی ختم ہونے والا ہے۔

اس جملہ میں طیبات حلال ہونے کا بیان ہے اور ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔ یعنی حلال کرتا ہے ان کے لئے طیبات اور حرام کرتا ہے اُن پر خبائث۔ اس میں طیبات کے بالمقابل خبائث لاکر ان دونوں لفظوں کی حقیقت واضح کردی گئی۔

لُغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابلِ نفرت چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے آیت کے اس جملہ نے یہ بتلادیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لئے حلال کی گئیں، اور جو گندی قابلِ نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ زندگی دنیا میں کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور جینے مرنے تک محدود ہو۔ اس کو قدرت نے مخدوم کائنات کسی خاص مقصد سے بنایا ہے اور وہ مقصدِ اعلیٰ پاکیزہ اخلاق کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے بداخلاق انسان درحقیقت انسان کہلانے کے قابل نہیں۔

اسی لئے قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ یعنی وہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ اور جب انسان کی انسانیت کا مدار اصلاح اخلاق پر ہو تو ضروری ہے کہ جتنی چیزیں انسانی اخلاق کو گندہ اور خراب کرنے والی ہیں اُن سے اس کا مکمل پرہیز کرایا جائے۔ انسان کے اخلاق پر اس کے گرد و پیش کی چیزوں اور اس کی سوسائٹی کا اثر تو بدیہی طور پر ہر شخص جانتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب گرد و پیش کی چیزوں سے انسانی اخلاق متاثر ہوتے ہیں تو جو چیزیں انسان کے بدن کا جزو بنتی ہیں اُن سے اخلاق کس قدر متاثر ہوں گے۔ اس لئے کھانے پینے کی ساری چیزوں میں اس کی احتیاط لازمی ہوئی۔ چوری، ڈاکہ۔ رشوت۔ سود۔ قمار وغیرہ کی حرام آمدنی جس کے بدن کا جزو بنے گی، وہ لازمی طور پر اس کو انسانیت سے دُور اور شیطنت سے قریب کردیگی۔ اسی لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا عمل صالح کے ساتھ اکل حلال کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ اکل حلال کے بغیر عمل صالح متصور نہیں۔ بالخصوص گوشت جو انسان کے بدن کا جزو اہم بنتا ہے اس میں اس کی احتیاط سب سے زیادہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا گوشت اس کی غذا میں داخل نہ ہو جو اس کے اخلاق کو خراب کرے اسی طرح وہ گوشت جو جسمانی طور پر انسان کے لئے مضر ہے کہ بیماری اور ہلاکت کے جراثیم اس میں ہیں۔ اس سے انسان کے پرہیز کا ضروری ہونا تو سبھی جانتے ہیں جنہیں چیزیں شریعت نے خبائث قرار دی ہیں۔ وہ یقینی طور پر انسان کے جسم یا روح یا دونوں کو خراب کرنے والی اور انسانی جان یا اخلاق کو تباہ کرنے والی ہیں۔ اس لئے ان کو حرام کر دیا گیا۔ اس کے بالمقابل طیبات سے انسان کے جسم و روح کی تربیت اور اخلاق فاضلہ کا نشو و نما ہوتا ہے ان کو حلال قرار دیا گیا۔ غرض قرآن پاک کے جملہ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ نے حلت و حرمت کا فلسفہ بھی بھی بتلا دیا اور اصول بھی۔

اب یہ بات کہ کونسی چیزیں طیبات یعنی صاف ستھری مفید اور مرغوب ہیں اور کونسی خبائث یعنی گندی، مضر اور قابل نفرت ہیں۔ اس کا اصل فیصلہ طبائع سلیمہ کی رغبت و نفرت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، ہر زمانہ کے سلیم الطبع انسان ان کو گندہ اور قابل نفرت سمجھتے رہے ہیں، جیسے مردار جانور، خون۔ البتہ بعض اوقات جاہلانہ رسوم طبیعت پر غالب آجاتی ہیں تو اچھے اور بُرے کی تمیز اٹھ جاتی ہے یا بعض چیزوں کا خبث مخفی ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں انبیاء علیہم السلام کا فیصلہ سب کے لئے حجت ہے کیونکہ افراد انسانی میں سب سے زیادہ سلیم الطبع انسان انبیاء علیہم السلام ہیں جنکو حق تعالیٰ نے مخصوص طور پر فطرت سلیمہ سے نوازا اور ان کی تربیت کا خود تکفل فرمایا۔ ان کے گرد و پیش اپنے فرشتوں کا پہرہ لگایا جس سے ان کے قلب و دماغ اور اخلاق کسی غلط ماحول سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے جن چیزوں کو خبائث قرار دیا وہ حقیقۃً خبائث ہیں اور جن کو طیبات سمجھا وہ حقیقۃً طیبات ہیں۔

چنانچہ نوح علیہ السلام کے زمانہ سے خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک ہر پیغمبر نے مردار جانور اور خنزیر وغیرہ کو حرام کرنے کا اپنے اپنے وقت میں اعلان فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ایسی خبائث ہیں کہ ہر زمانے کے سلیم الطبع حضرات نے ان کو گندی اور مضر چیز سمجھا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمایا ہے کہ جتنے جانور شریعت اسلام نے حرام قرار دئے ہیں، ان سب پر غور کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب

دو اصولوں کے تحت آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جانور اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے خبیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ذبیحہ کے بجائے مَیتَہ یعنی مُردار قرار دیا جائے گا۔

سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں نو چیزوں کو حرام بتلایا ہے۔ ان میں خنزیر قسم اوّل میں داخل ہے۔ باقی آٹھ قسم دوم میں۔ قرآن کریم نے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ فرما کر اجمالی طور پر تمام خبیث جانوروں کے حرام ہونے کا حکم دیا۔ اور اس کی تفصیل میں سے چند چیزیں قرآن نے صراحۃً بیان فرما دیں۔ جیسے لَحْمَ خِنْزِيْرٍ اور دَمٍ مَّسْفُوْحٍ وغیرہ۔ باقی چیزوں کا بیان رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی جانور کے خبیث ہونے کی ایک علامت یہ بتلائی کہ کسی قوم کو بطور عذاب کے جس جانور کی شکل میں مسخ و تبدیل کیا گیا ہو تو یہ علامت اس کی ہے کہ یہ جانور طبعاً خبیث ہے کہ جن لوگوں پر حق تعالیٰ کا غضب نازل ہوا ان کو اس جانور کی شکل دی گئی۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ یعنی بعض قوموں کو خنزیر اور بندر کی شکل میں بطور عذاب کے مسخ کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی یہ دونوں قسمیں بالطبع خبائث میں داخل ہیں۔ ان کو باقاعدہ ذبح بھی کر دیا جائے تو بھی حلال نہیں ہو سکتے۔ اور بہت سے جانور ایسے بھی ہیں کہ افعال و آثار سے اُن کا خبیث ہونا عام طبائع خود بھی محسوس کر لیتی ہیں۔ مثلاً درندے جانور، جن کا کام ہی دوسرے جانوروں کو زخمی کرنا، پھاڑ نا کھانا ہے اور سخت دِلی ہے۔

اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھیڑیئے کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کہ کیا کوئی انسان اس کو کھا سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے ایسے جانور ہیں جن کی خصلت ایذا رسانی۔ چیزوں کو اچک لینا ہے۔ جیسے سانپ۔ بچھو۔ چھپکلی۔ مکھی۔ یا چیل اور باز وغیرہ۔

اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ضابطہ کے طور پر بیان فرمایا کہ ہر درندہ جانور جو دانتوں سے پھاڑ کھاتا ہے، جیسے شیر، بھیڑیا وغیرہ۔ اور پرندوں میں وہ جانور جو اپنے پنجے سے شکار کرتے ہیں۔ جیسے باز، شکرہ وغیرہ یہ سب حرام ہیں۔ یا ایسے جانور جن کی طبیعت میں خست اور ذلت یا نجاست کے ساتھ ملوث ہونا ہے، جیسے چوہا یا مردار خور جانور یا گدھا وغیرہ، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان جانوروں کے طبعی خواص اور ان کا مضر ہونا ہر انسان جو معمولی سلامت طبع رکھتا ہو محسوس کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن جانوروں کو شریعتِ اسلام نے حرام قرار دیا ہے ان میں ایک قسم تو وہ ہے جن میں ذاتی طور پر خبث پایا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ ان کی ذات میں کوئی خبث نہیں۔ مگر جانوروں کے ذبح کرنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے اس طریقہ پر اسکو ذبح نہیں کیا گیا خواہ سرے سے ذبح ہی نہیں کیا گیا ہو۔ جیسے جھٹکا کر کے مارا ہوا یا چوٹ کے ذریعہ مارا ہوا جانور یا ذبح تو کیا مگر اس پر اللہ کے نام کے بجائے کسی غیر اللہ کا نام لیا یا کسی کا بھی نہ لیا اور جان بوجھ کر اللہ کے نام کو بوقت ذبح چھوڑ دیا تو یہ ذبح بھی شرعاً معتبر نہیں بلکہ ایسا ہی ہے جیسے کسی جانور کو بغیر ذبح کے ہلاک کر دیا ہو۔

یہاں ایک بات خاص طور سے قابلِ غور ہے کہ انسان جو کچھ کھاتا پیتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ مگر جانوروں کے سوا اور کسی چیز کے کھانے پکانے پر یہ پابندی نہیں ہے کہ اَللّٰہُ اَکْبَر یا بِسْمِ اللّٰہ کہہ کر ہی کھایا پکایا جائے اس کے بغیر وہ حلال ہی نہ ہو، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہر چیز کھانے پینے کے وقت بِسْمِ اللّٰہ کہنا مستحب قرار دیا جاتا ہے۔ بخلاف جانوروں کے ان کے ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا واجب قرار دیا گیا اور جان بوجھ کر کوئی اس وقت اللہ کا نام ترک کر دے تو جانور کو مردار اور حرام قرار دیا گیا اس میں حکمت کیا ہے۔

غور کیا جائے تو فرق واضح ہے کہ جانداروں کی جانیں ایک حیثیت سے سب برابر ہیں۔ اس لئے ایک جاندار کیلئے دوسرے جاندار کو فنا کرنا اور ذبح کر کے کھا لینا بظاہر جائز نہ ہونا چاہیئے۔ اب جن کے لئے یہ جائز کیا گیا تو اُن پر اللہ تعالیٰ کا ایک بھاری انعام ہے۔ اس لئے جانور کو ذبح کرنے کے وقت اس نعمتِ الٰہیہ کا استحضار اور ادائے شکر ضروری قرار دیا گیا۔ بخلاف غلہ، دانہ، پھل وغیرہ کہ ان کی پیدائش ہی اس لئے ہے کہ انسان اُن کو فنا کر کے اپنی ضروریات پوری کرے۔ اس لئے ان پر صرف بسم اللہ کہنا مستحب کے درجہ میں رکھا گیا ہے، واجب اور ضروری نہیں کیا گیا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زمانۂ جاہلیت سے یہ رسم جاری تھی کہ مشرکین جانوروں کے ذبح کے وقت اپنے بتوں کے نام لیا کرتے تھے۔ شریعتِ اسلام نے ان کی اس کافرانہ رسم کو ایک بہترین عبادت میں تبدیل کر دیا کہ اللہ کا نام لینا ضروری قرار دیا۔ اور اس مشرکانہ رسم کو مٹانے کی مناسب صورت یہی تھی کہ غلط نام کی بجائے کوئی صحیح نام تجویز کر دیا جائے۔ ورنہ چلی ہوئی رسم و عادت کا چھوٹنا مشکل ہوتا۔ یہاں تک آیت کے پہلے جملے کی تشریح تھی۔ دوسرا جملہ یہ ہے۔ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ

حِلٌّ لَّھُمْ۔ یعنی اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔ اور تمہارا کھانا اہلِ کتاب کے لئے حلال۔

اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک کھانے سے مراد ذبیحہ جانور ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ابوالدرداء، ابراہیم، قتادہ، سدی، ضحاک، مجاہد، رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہی منقول ہے (روح المعانی و جصاص) کیونکہ دوسری قسم کے کھانوں میں اہلِ کتاب اور بت پرست، مشرکین سب برابر ہیں کہ روٹی۔ آٹا۔ دال۔ چاول۔ پھل وغیرہ جن میں ذبح کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی بھی جائز طریقہ پر حاصل ہو تو مسلمان کو اس کا کھانا جائز ہے۔ اور مسلمانوں سے اُن کو ملے تو اُن کے لئے حلال ہے۔ اس لئے خلاصۂ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ مسلمان کے لئے اور مسلمان کا ذبیحہ اہلِ کتاب کے لئے حلال ہے۔

اب اس جگہ چند مسائل قابلِ غور ہیں: اول یہ کہ اہلِ کتاب قرآن و سنت کی اصطلاح میں کون لوگ ہیں۔ کتاب سے کیا مراد ہے؟ اور کیا اہلِ کتاب ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ اپنی کتاب پر صحیح طور سے ایمان و عمل رکھتے ہوں۔ اس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کتاب کے لغوی معنی یعنی ہر لکھا ہوا ورق تو مراد ہو نہیں سکتا۔ وہ ہی کتاب مراد ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہو۔ اس لئے بالاتفاق اُمت کتاب سے مُراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہونا بتصدیقِ قرآن یقینی ہو۔ جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ و ابراہیم وغیرہ۔ اس لئے وہ قومیں جو کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی اور اس کو وحی الٰہی قرار دیتی ہوں جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن و سنت کے یقینی ذرائع سے ثابت نہیں۔ وہ قومیں اہلِ کتاب میں داخل نہیں ہوں گی۔ جیسے مشرکین مکہ۔ مجوس۔ بت پرست ہندو۔ بدھ آریہ۔ سکھ وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جو تورات و انجیل پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ باصطلاح قرآن اہلِ کتاب میں داخل ہیں۔ تیسری ایک قوم جس کو صابئین کہتے ہیں ان کے حالات مشتبہ ہیں۔ جن حضرات کے نزدیک یہ لوگ زبورِ داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو بھی اہلِ کتاب میں شامل قرار دیتے ہیں۔ اور جن کو یہ تحقیق ہوا کہ زبور سے ان کا کوئی تعلق نہیں، یہ نجوم پرست قوم ہیں۔ وہ ان کو بت پرستوں اور مجوس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں۔ بہرحال یقینی طور پر جن کو بالاتفاق اہلِ کتاب کہا جاتا ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ تو قرآنِ حکیم کے اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ مسلمانوں

کے لئے اور مسلمانوں کا ذبیحہ اُن کے لئے حلال ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ یہود ونصاریٰ کو اہل کتاب کہنے اور سمجھنے کے لئے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات وانجیل پر عمل رکھتے ہوں۔ یا محرّف تورات اور انجیل کا اتباع کرنے والے اور عیسیٰ ومریم علیہما السلام کو خدا کا شریک قرار دینے والے بھی اہل کتاب میں داخل ہیں۔ سو قرآن کریم کی بے شمار تصریحات سے واضح ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اسکی اتباع کرنے کے دعویدار ہوں۔ خواہ وہ اس کے اتباع میں کتنی گمراہیوں میں جا پڑے ہوں۔

قرآن کریم نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا۔ انھیں کے بارے میں یہ بھی جابجا ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں۔ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یہود نے حضرت عُزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ۔ ان حالات وصفات کے باوجود جب قرآن نے انکو اہل کتاب قرار دیا تو معلوم ہوا کہ یہود ونصاریٰ جب تک یہودیت ونصرانیت کو بالکل نہ چھوڑ دیں وہ اہل کتاب میں داخل ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی عقائد فاسدہ اور اعمال سیئہ میں مبتلا ہوں۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ کے عہد خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر یہ دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم بھی یہود کی طرح کرتے ہیں مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے تحریر فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا ایک فرقہ سمجھے جائیں گے۔

صرف نام کے یہودی ونصرانی جو درحقیقت دہریئے ہیں وہ اس میں داخل نہیں۔

آجکل یورپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی مردم شماری کے اعتبار سے یہودی یا نصرانی کہلاتے ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود اور کسی مذہب ہی کے قائل نہیں۔ نہ تورات وانجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور نہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی وپیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ شخص مردم شماری کے نام کی وجہ سے اہل کتاب کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے۔

نصاریٰ کے بارے میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں اسکی

وجہ یہ بتلائی کہ یہ لوگ دین نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کسی چیز کے قائل نہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد یہ ہے کہ

روی ابن الجوزی بسندہ عن علیؓ قال لا تأکلوا من ذبائح نصاریٰ بنی تغلب فانھم لم یتمسکوا من النصرانیۃ بشیء الا شرب الخمر ورواہ الشافعی بسند صحیح عنہ (تفسیر مظہری ص۲۴، جلد ۳ مائدہ)۔

ابن جوزی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت علی رضؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نصاریٰ بنی تغلب کے ذبائح کو نہ کھاؤ۔ کیونکہ انھوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے سوا کچھ نہیں لیا۔ امام شافعی نے بھی سند صحیح کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بنی تغلب کے متعلق یہی معلومات تھیں کہ وہ بے دین ہیں نصرانی نہیں۔ اگرچہ نصرانی کہلاتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذبیحہ سے منع فرمایا۔ جمہور صحابہ وتابعین کی تحقیق یہ تھی کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں۔ بالکل دین کے منکر نہیں۔ اس لئے انھوں نے ان کا ذبیحہ بھی حلال قرار دیا۔

وقال جمھور الامۃ ان ذبیحۃ کل نصرانی حلال سواء کان من بنی تغلب او غیرھم وکذالک الیھود۔ (تفسیر قرطبی ص۷۸، جلد ۶)

اور جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے۔ خواہ بنی تغلب میں سے ہو، یا ان کے سوا کسی دوسرے قبیلہ اور جماعت سے ہو، اسی طرح ہر یہودی کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے۔ وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟

طعام کے لغوی معنے کھانے کی چیز کے ہیں۔ جس میں از روئے لغت عربی ہر قسم کی کھانے کی چیزیں داخل ہیں۔ لیکن جمہور امت کے نزدیک اس جگہ طعام سے مُراد صرف اہل کتاب کے ذبائح کا گوشت ہے۔ کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیاء خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں۔ کھانے پینے کی خشک چیزیں۔ گیہوں۔ چنا۔ چاول۔ اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا حلال وجائز ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اور جس کھانے میں انسانی صنعت

کو دخل ہے۔ اس میں چونکہ کفار کے برتنوں اور ہاتھوں کی طہارت کا کوئی بھروسہ نہیں اسلئے احتیاط اس میں ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ بلا ضرورت شدیدہ استعمال نہ کریں، مگر اس میں جو حال مشرکین، بُت پرستوں کا ہے، وہی اہلِ کتاب کا بھی ہے کہ نجاست کا احتمال دونوں میں برابر ہے۔

خُلاصَہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور دُوسرے کفار کے طعام میں جو فرق شرعاً ہوسکتا ہے وہ صرف اُن کے ذبائح کے گوشت میں ہے۔ اس لئے آیتِ مذکورہ میں باتفاق امت طعام اہلِ کتاب سے مُراد ان کے ذبائح ہیں۔ امامِ تفسیر قرطبیؒ نے لکھا ہے :-

والطعام اسم لما یؤکل والذبائح منه وھو ھھنا خاص بالذبائح عند کثیر من اھل العلم بالتأویل واما ما حرم من طعامھم فلیس بداخل فی عموم الخطاب۔

(قرطبی ص۷۶، ج ٦)

لفظ طعام ہر کھانے کی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس میں ذبائح بھی داخل ہیں۔ اور اس آیت میں طعام کا لفظ خاص ذبائح کے لئے استعمال کیا گیا ہے اکثر علمار تفسیر کے نزدیک، اور اہلِ کتاب کے طعام میں سے جو چیزیں مسلمانوں کے لئے حرام ہیں۔ وہ اس عموم خطاب میں داخل نہیں۔

اِس کے بعد امام قرطبیؒ نے مزید تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے :-

لاخلاف بین العلماء ان مالا یحتاج الی ذکاۃ کالطعام الذی لا محاولة فیه کالفاکھة والبر۔ جائز اکله اذ لا یضر فیه تملك احد والطعام الذی تقع فیه المحاولة علی ضربین احدھما ما فیه محاولة صنعة لا تعلق لھا بالدین کخبز الدقیق وعصر الزیت ونحوہ۔ فھذا ان تجنب من الذمی فعلی وجه التقذر۔ والضرب الثانی التذکیة التی ذکرنا انھا ھی التی تحتاج الی الدین والنیة۔ فلما کان القیاس ان لا تجوز ذبائحھم کما

علمار کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ چیزیں جن میں ذبح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ کھانا جس میں تصرف نہیں کرنا پڑتا جیسے میوہ اور گندم وغیرہ اس کا کھانا جائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں کسی کا مالک بننا چنداں مضر نہیں ہے۔ البتہ وہ کھانا جس میں انسان کو کچھ عمل کرنا پڑتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں کوئی ایسا کام کرنا پڑے جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو، مثلاً آٹے سے روٹی بنانا زیتون سے تیل نکالنا وغیرہ تو کافر ذمی کی ایسی چیزوں سے اگر کوئی بچنا چاہے تو وہ محض طبعی کراہت کی بنا پر ہوگا۔ اور دوسری

نقول انھم لا صلاۃ لھم ولا عبادۃ مقبولة له رخص اللہ تعالیٰ فی ذبائحھم علی ھذہ الأمة واخرجھا النص عن القیاس علی ما ذکرنا من قول ابن عباس۔

(قرطبی سورۂ مائدہ ص۷۷، ج ٦)

قسم وہ ہے، جس میں عمل ذبح کرنا پڑتا ہے جس کے لئے دین اور نیت کی ضرورت ہے تو اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کافر کی نماز اور عبادتوں کی طرح اس کا عمل ذبح بھی قبول نہ ہونا چاہیئے تھا، لیکن اللہ نے اس امت کے لئے خاص طور پر ان کے ذبائح حلال کردیئے اور حضرت ابن عباس رضؓ کی نص نے اس مسئلہ کو خلاف قیاس ثابت کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طعام اہلِ کتاب سے مُراد اس آیت میں باتفاق علمار تفسیر وہ طعام ہے جسکی حلت مذہب اور عقیدہ پر موقوف ہے یعنی ذبیحہ۔ اسی لئے اس طعام میں اہلِ کتاب کے ساتھ امتیازی معاملہ کیا گیا۔ کیونکہ وہ بھی اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان کے مدعی ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریفات نے ان کے دعوی کو مجروح کردیا۔ یہاں تک کہ شرک وکفر میں مبتلا ہوگئے۔ بخلاف بُت پرست مشرکین کے کہ وہ کسی آسمانی کتاب یا نبی یا رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی نہیں رکھتے۔ اور جن کتابوں یا شخصیتوں پر ان کا ایمان ہے۔ وہ نہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں اور نہ ان کا رسُول و نبی ہونا اللہ کے کسی کلام سے ثابت ہے۔

اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال ہونے کی حکمت اور وجہ

زیر بحث مسئلہ کا یہ تیسرا سوال ہے۔ اس کا جواب اکثر صحابہ وتابعین اور ائمہ تفسیر کی طرف سے یہ ہے کہ تمام کفار میں سے اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح حلال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے دین میں سینکڑوں تحریفات ہونے کے باوجود اِن دو مسئلوں میں ان کا مذہب بھی اسلام کے بالکل مطابق ہے۔ یعنی وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا عقیدۃً ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر جانور کو مردار میتہ اور ناپاک وحرام قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح مسئلہ نکاح میں جن عورتوں سے اسلام میں نکاح حرام ہے ان کے مذہب میں بھی حرام ہے، اور جس طرح اسلام میں نکاح کا اعلان اور گواہوں کے سامنے ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ان کے موجودہ مذہب میں بھی یہی احکام ہیں۔

امام تفسیر ابن کثیرؒ نے یہی قول اکثر صحابہ وتابعین کا نقل فرمایا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے :-

(وطعام اهل الكتاب) قال ابن عباس وابو امامة ومجاهد وسعيد بن جبير وعكرمه وعطاء والحسن ومكحول وابراهيم النخعي والسدي ومقاتل بن حيان يعني ذبائحهم حلال للمسلمين لانهم يعتقدون تحريم الذبح لغير الله ولا يذكرون على ذبائحهم الا اسم الله وان اعتقدوا فيه تعالیٰ ما هو منزه عنه تعالیٰ وتقدس (ابن کثیر مائدہ ص۱۹ ج ۳)

ابن عباس، ابوامامہ مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، عکرمہؒ عطاءرح، حسن رح، مکحول رح، ابراہیم نخعی رح، سدی رح، اور مقاتل بن حیان رح نے طعام اہل کتاب کی تفسیر اُن کے ذبائح کے ساتھ کی ہے۔ اور یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے یہاں اجماعی ہے کہ ان کے ذبیحے مسلمانوں کے لئے حلال ہیں۔ کیونکہ وہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ اور اپنے ذبیحوں پر خدا کے سوا اور کسی کا نام نہیں لیتے۔ اگرچہ وہ اللہ کے بارے میں ایسی باتوں کے معتقد ہوں۔ جن سے باری تعالیٰ پاک، اور بلند و بالا ہے۔

ابن کثیر کے اس بیان میں ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام مذکور الصدر حضرات صحابہؓ و تابعین کے نزدیک طعام اہل کتاب سے ان کے ذبائح مراد ہیں۔ اور ان کے حلال ہونے پر امت کا اجماع ہیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان سب حضرات کے نزدیک ذبائح اہل کتاب کے حلال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے مذہب میں بہت سی تحریفات کے باوجود ذبیحہ کا مسئلہ اسلامی شریعت کے مطابق باقی ہے کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو وہ بھی حرام کہتے ہیں۔ اور ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں وہ تثلیث کے مشرکانہ عقیدہ کے قائل ہو گئے۔ اور اللہ اور مسیح بن مریم کو ایک ہی کہنے لگے۔ جس کا قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔

بے شک کافر ہو گئے وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ ذبیحہ کے متعلق تمام قرآنی آیات جو سورۃ بقرہ اور سورۃ انعام میں آئی ہیں، جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو بھی اور اس جانور کو بھی جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، حرام قرار دیا ہے۔ یہ سب آیتیں اپنی جگہ پر محکم اور معمول بہا ہیں۔ سورۃ مائدہ کی آیت جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے، وہ بھی ان آیات کے حکم سے مختلف نہیں کیونکہ طعام اہل کتاب کو حلال قرار دینے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان کے موجودہ مذہب میں

بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور، اور وہ جانور جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا حرام ہے۔ موجودہ زمانے میں توراۃ و انجیل کے جو نسخے اب بھی موجود ہیں ان میں بھی ذبیحہ اور نکاح کے احکام تقریباً وہی ہیں جو قرآن کریم اور اسلام میں ہیں۔ جن کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جاہل عوام اپنے مذہب کے اس حکم کے خلاف کچھ عمل کرتے ہوں، جیسا کہ خود مسلمانوں کے جاہل عوام میں بھی بہت سی جاہلانہ رسمیں شامل ہو گئی ہیں مگر ان کو مذہب اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ نصاریٰ کے جاہل عوام کے طرز عمل کو دیکھ کر ہی بعض حضرات تابعین نے یہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اپنے ذبائح کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ کوئی اس پر مسیح یا عزیر کا نام لیتا ہے، کوئی بغیر تسمیہ کے ذبح کرتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آیت مائدہ جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے۔ اس آیت نے اہل کتاب کے ذبائح کے حق میں سورۃ بقرہ اور سورۃ انعام کی ان آیتوں میں تخصیص یا ایک قسم کا نسخ قرار دیا ہے جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کو یا بغیر اللہ کے نام کے ذبح کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔

بعض اکابر علماء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات تابعین نے اہل کتاب کے متروک التسمیہ ذبیحہ اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو حلال فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک بھی اہل کتاب کا اصل مذہب تو اسلامی احکام سے مختلف نہیں ہے۔ مگر ان کے جاہل عوام یہ غلطیاں کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان حضرات نے جاہل اہل کتاب کو بھی عام اہل کتاب کے حکم سے الگ نہیں کیا۔ اور ذبیحہ اور نکاح کے معاملہ میں ان کا بھی وہی حکم رکھا جو ان کے آباء و اجداد اور اصل مذہب کے پیروؤں کا ہے کہ ان کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے استاد ابوالفتح مقدسی سے سوال کیا کہ موجودہ نصاریٰ تو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں، مثلاً مسیح یا عزیر کا نام بوقت ذبح لیتے ہیں تو ان کا ذبیحہ کیسے حلال ہو سکتا ہے۔ اس پر ابوالفتح مقدسی نے فرمایا:-

هم من آبائهم وقد جعلهم الله تعالیٰ تبعا لمن كان قبلهم مع علمه بحالهم۔ (احکام ابن عربی ص۲۲۹، جلد اول)

ان کا حکم اپنے آباء اجداد کا سا ہے۔ (آج کے اہل کتاب کا) یہ حال اللہ کو معلوم تھا، لیکن اللہ نے ان کو ان کے آباء کے تابع بنا دیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اسلافِ امت میں جن حضرات علماء نے اہلِ کتاب کے ایسے ذبائح کی اجازت دیدی ہے جن پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا بلکہ غیر اللہ کا لیا گیا - ان کے نزدیک بھی اصل مذہب اہلِ کتاب کا یہی ہے کہ یہ چیزیں ان کے مذہب میں بھی حرام ہیں مگر ان حضرات نے غلط کار عوام کو بھی اس حکم میں شامل رکھا جو اصل اہل کتاب کا حکم ہے - اس لئے ان کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دے دیا - اور جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے اس پر نظر فرمائی کہ اہلِ کتاب کے جاہل عوام جو غیر اللہ کے نام یا بغیر اللہ کے نام کے ذبح کرتے ہیں - یہ اسلامی حکم کے تو خلاف ہے ہی، خود نصاریٰ کے موجودہ مذہب کے بھی خلاف ہے - اس لئے ان کے عمل کا احکام پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہیئے - انھوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان لوگوں کا ذبیحہ طعام اہلِ کتاب میں داخل ہی نہیں - اس لیۓ اس کے حلال ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور اُن کے غلط عمل کی وجہ سے آیات قرآنی میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کرنا کسی طرح صحیح نہیں -

اسی لیۓ تمام ائمہ تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، ابوحیان وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ سورۂ بقرہ اور انعام کی آیات میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا - یہی جمہور صحابہ و تابعین کا مذہب ہے جیسا کہ بحوالہ ابن کثیر اوپر نقل ہو چکا ہے - اور تفسیر بحرِ محیط میں بالفاظ ذیل مذکور ہے -

وذهب الى ان الكتابى اذا لم يذكر الله على الذبيحة وذكر غير الله لم تؤكل وبه قال ابوالدرداء وعبادة بن الصامت وجماعة من الصحابة وبه قال ابو حنيفة وابو يوسف ومحمد وزفر ومالك وكره النخعى والثورى اكل ماذبح واهل به لغير الله -

(بحر محیط ص ۴۳۱ - ج ۴)

ان کا مذہب یہ ہے کہ کتابی اگر ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لے اور اللہ کے سوا کوئی نام لے تو اس کا کھانا جائز نہیں - یہی قول ہے ابوالدرداء، عبادہ بن صامت اور صحابہ کرام کی ایک جماعت کا - اور یہی ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد، زفر اور مالک کا مذہب ہے نخعی اور ثوری اس کھانے کو مکروہ قرار دیتے ہیں -

حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہ و تابعین اور اسلاف امت کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اہلِ کتاب کا اصل مذہب زمانۂ نزول قرآن میں بھی یہی تھا کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا جائے یا قصداً اللہ کا نام چھوڑا جائے وہ حرام ہے - اسی طرح نکاح کی حلت و حرمت میں بھی اہل کتاب کا اصل مذہب موجودہ زمانے تک اکثر چیزوں میں اسلامی شریعت کے مطابق ہے اس کے خلاف جو کچھ اہلِ کتاب میں پایا گیا، وہ جاہل عوام کے اغلاط ہیں ان کا مذہب

نہیں ہے -

موجودہ تورات و انجیل جو مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں - ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے - ملاحظہ ہوں ان کے مندرجہ ذیل اقوال - بائبل کے عہد نامہ قدیم میں جو موجودہ زمانہ کے یہود و نصاریٰ دونوں کے نزدیک مسلّم ہے -

ذبیحہ کے متعلق یہ احکام ہیں :-

(۱) جو جانور خود بخود مر گیا ہو - اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو - ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ، تم اسے کسی حال میں نہ کھانا - (احبار ۷ - ۲۴)

(۲) پر گوشت کو تو اپنے سب پھاٹکوں کے اندر اپنے دل کی رغبت اور خداوند اپنے دی ہوئی برکت کے موافق ذبح کر کے کھا سکے گا ...... لیکن تم خون کو بالکل نہ کھانا -

(استثنا ۱۲ - ۱۵)

(۳) تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں - اور حرام کاری سے پرہیز کرو - (عہد نامہ جدید کتاب اعمال ۱۵ - ۲۹)

(۴) عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا پولس کرنتھیون کے نام پہلے خط میں لکھتا ہے کہ جو قربانی غیر قومیں کرتی ہیں شیاطین کے لئے قربانی کرتی ہیں، نہ کہ خدا کے لئے اور میں نہیں چاہتا کہ تم شیاطین کے شریک ہو - تم خداوند کے پیالے اور شیاطین کے پیالے دونوں میں سے نہیں پی سکتے - (کرنتھیون ۱۰ - ۲۰ - ۲۰)

(۵) کتاب اعمال حوارین میں ہے - ہم نے یہ فیصلہ کر کے لکھا تھا کہ وہ صرف بتوں کی قربانی کے گوشت سے اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں، اور حرام کاری سے اپنے آپ کو بچاتے رکھیں - (اعمال ۲۱ - ۲۵)

یہ تورات و انجیل کے وہ تصریحات ہیں جو آجکل کی بائبل سوسائیٹیوں نے چھاپی ہوئی ہیں، جن میں سینکڑوں تحریفات و ترمیمات کے بعد بھی بعینہٖ قرآن کریم کے احکام کے مطابق یہ چیزیں باقی ہیں - قرآن کریم کی آیت یہ ہے کہ

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ - (المائدہ ۳)

تم پر حرام کر دیا گیا مُردار اور خون اور خنزیر کا گوشت - اور جس پر اللہ کے سوا اور کسی کا نام پکارا گیا ہو - اور گلا گھونٹا ہوا، اور چوٹ کھا کر مرا ہوا - اور گر کر مرا ہوا - اور سینگ کھا کر مرا ہوا - اور جسے درندہ نے کھایا ہو - اِلّا یہ کہ

تم نے اس کو پاک کرلیا ہو۔ اور وہ جانور جو بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے۔

اس آیت نے مَیتَۃ یعنی خود مرا ہوا جانور، اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اور گلا گھونٹا ہوا جانور اور چوٹ سے مارا یا اونچی جگہ سے گر کر مرا ہوا۔ یا سینگوں کی چوٹ سے مارا ہوا۔ اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو سب حرام قرار دیئے ہیں۔ توراۃ و انجیل کی مذکورہ تصریحات میں بھی "لحم خنزیر" کے علاوہ تقریباً سبھی کو حرام قرار دیا ہے۔ صرف چوٹ سے یا اونچی جگہ سے گر کر یا سینگوں سے مرنے والے جانور کی تفصیل اگرچہ مذکور نہیں ہے۔ مگر وہ سب تقریباً خود مرے یا گلا گھونٹ کر مارے ہوئے کے حکم میں داخل ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم نے ذبیحہ پر اللہ کے نام لینے کی تاکید فرمائی ہے فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ اور جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو حرام کیا ہے وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ بائبل میں کتاب استثنار کی عبارت مذکورہ ۲ سے بھی اس کی تاکید مفہوم ہوتی ہے کہ جانور کو اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے۔ اسی طرح نکاح کے معاملات بھی اہل کتاب کا مذہب اکثر چیزوں میں شریعت اسلام کے مطابق ہے۔

ملاحظہ ہو۔ احبار۔ ۱۸۔ ۶ تا ۔ ۱۹ جس میں ایک طویل فہرست محرمات کی دی گئی ہے اور جن میں بیشتر وہی ہیں جن کو قرآن نے حرام کیا ہے، یہاں تک کہ جمع بین الاختین۔ یعنی دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنے کی حرمت اور حالت حیض میں صحبت کا حرام ہونا بھی اس میں مصرح ہے۔ نیز بائبل میں اس کی بھی تصریح ہے کہ بت پرست اور مشرک اقوام سے نکاح جائز نہیں۔ موجودہ توراۃ کے الفاظ یہ ہیں۔

"تو ان سے بیاہ، شادی بھی نہ کرنا۔ نہ اُن کے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا۔ اور نہ اپنے بیٹوں کے لئے، اُن کی بیٹیاں لینا۔ کیونکہ وہ میرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کر دیں گے۔ تاکہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں" (استثنا ۷۔ ۳۔ ۴)

خُلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن میں اہل کتاب کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح کو حلال اور دوسرے کفار کے ذبائح اور نساء کو حرام قرار دینے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں اہل کتاب کا اصل مذہب آج تک بھی اسلامی قانون کے مطابق ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ان کے عوام میں پایا جاتا ہے وہ جاہلوں کے اغلاط ہیں۔ اُن کا مذہب نہیں ہے۔ اسی لئے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک سورۂ بقرہ

انعام اور مائدہ کی تمام آیات میں کوئی تضاد، یا نسخ، یا تخصیص نہیں ہے۔ اور جن علماء و تابعین نے غلط کار عوام کے عمل کو بھی تبعاً اہل کتاب کے حکم میں شامل رکھا اور آیات بقرہ و انعام میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کیا ہے۔ اس کی بھی بنیاد یہ ہے کہ نصارٰی جن کا قول یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ یعنی اللہ تو عیسٰی بن مریم ہی ہیں۔ یہ لوگ اگر اللہ کا نام بھی لیں تو اس سے مراد عیسٰی بن مریم ہی لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذبیحہ میں اللہ کا نام لینا یا مسیح کا نام لینا برابر ہو گیا۔ اس بنا پر ان حضرات تابعین نے ذبائح اہل کتاب میں اس کی اجازت دیدی ہے۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں اس بنیاد کی وضاحت فرمائی ہے۔

(احکام ابن عربی ص ۲۲۹، جلد ۱)

مگر جمہور امت نے اس کو قبول نہیں کیا۔ جیسا کہ بحوالہ تفسیر ابن کثیر و تفسیر بحر محیط ابھی گذر چکا ہے۔ اور تفسیر مظہری میں اقوال مختلف نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

وَالصحیح المختار عندنا ھو القول الاول۔ یعنی ذبائح اھل الکتاب تارکا للتسمیہ عامدًا او علی غیر اسم اللہ تعالٰی لا یوکل ان علم ذالك یقینًا او کان غالب حالھم ذٰلك وھو محمل النھی عن اکل ذبائح نصاری العرب ومحمل قول علی رض لا تاکلوا من ذبائح نصاری بنی تغلب فانھم لم یتمسکوا من النصرانیۃ بشیٔ الا بشرب الخمر فلعل علیًا علم من حالھم انھم لا یسمون اللہ عند الذبح او یذبحون علی غیر اسم اللہ ھکذا حکم نصاری العجم ان کان عادتھم الذبح علی غیر اسم اللہ تعالٰی غالبًا لا یوکل ذبیحتھم ولا شك ان النصاری فی ھذا الزمان لا یذبحون بل یقتلون بالوقذ غالبًا فلا یحل طعامھم۔

(تفسیر مظہری ص ۳۹ ۔ جلد ۳)

اور صحیح اور مختار ہمارے نزدیک وہ پہلا ہی قول ہے یعنی یہ کہ اہل کتاب کے ذبائح جن پر قصداً اللہ کا نام لینا چھوڑ دیا ہو، یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے ہوں۔ وہ حلال نہیں، اگر یقینی طور پر اس کا علم ہو جائے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا یا غیر اللہ کا لیا ہے، یا اہل کتاب کی عام عادت یہ ہو جائے، جن بزرگوں نے عرب کے نصارٰی کے ذبائح کو منع کیا ہے اُن کے قول کا مقصد بھی یہی ہے۔ اسی طرح حضرت علی رض نے جو یہ فرمایا کہ نصارٰی بنی تغلب کے ذبائح کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ انھوں نے مذہب نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کچھ نہیں لیا۔ اس کا محمل بھی یہی ہے حضرت علی رض کو یہ ثابت ہوا ہوگا کہ بنی تغلب اپنے ذبائح پر اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یا پھر غیر اللہ کا نام لیتے ہیں۔

پس یہی حکم عجمی نصارٰی کا بھی ہے کہ اگر ان کی عادت یہی ہو جائے کہ عام طور پر غیر اللہ

کے نام پر ذبح کرتے ہیں، تو ان کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں اور اس میں شک نہیں کہ آجکل کے نصاریٰ تو ذبح ہی نہیں کرتے بلکہ عام طور پر چوٹ مار کر ہلاک کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔

یہ تفصیلی بحث یہاں اس لئے نقل کی گئی کہ اس مقام پر مصر کے مشہور عالم مفتی عبدہ سے ایک سخت لغزش ہو گئی ہے جس کے غلط اور کتاب وسنت اور جمہور امت کے خلاف ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ موصوف سے تفسیر المنار میں اس جگہ دوہری غلطی ہوئی ہے۔

اوّل تو اہل کتاب کے مفہوم میں دنیا کے کفار۔ مجوس۔ ہندو۔ سکھ وغیرہ سب کو داخل کر کے اتنا عام کر دیا کہ پورے قرآن میں جو کفار اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی تقسیم وتفریق کی گئی ہے وہ بالکل بے معنی اور بے حقیقت ہو جاتی ہے۔

اور دوسری غلطی اس سے بڑی یہ ہوئی کہ طعام اہل کتاب کے مفہوم میں اہل کتاب کے ہر کھانے کو بلا کسی شرط کے حلال کر دیا۔ خواہ وہ جانور کو ذبح کریں یا نہ کریں۔ اور اس پر اللہ کا نام لیں یا نہ لیں۔ ہر حال میں وہ جانور کو جس طرح کھاتے ہیں اس کو مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا۔

جس وقت ان کا یہ فتویٰ مصر میں شائع ہوا اس وقت خود مصر کے اور دنیا کے تمام اکابر علماء نے اس کو غلط قرار دیا۔ اس پر بہت سے مقالے اور رسالے لکھے گئے۔ مفتی عبدہ کو عہدۂ فتوے سے معزول کرنے کے مطالبات ہر طرف سے ہوئے۔ ادھر مفتی صاحب موصوف کے شاگردوں اور کچھ مغرب زدہ یورپین معاشرے کے دلدادہ لوگوں نے بحثیں چلائیں۔ کیونکہ یہ فتویٰ ان کی راہ کی تمام مشکلات کا حل تھا کہ یورپ کے یہود ونصاریٰ بلکہ دہریوں کا ہر کھانا ان کے لئے حلال ہو گیا۔

لیکن اسلام کا یہ بھی معجزہ ہے کہ خلاف شریعت کام خواہ کتنے ہی بڑے عالم سے کیوں نہ ہو جائے۔ عام مسلمانوں کے قلوب اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ اور پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس کو گمراہی قرار دیا۔ اور اس وقت یہ معاملہ دب کر رہ گیا۔ مگر زمانہ حال کے ملحدین جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کیا جائے کہ جس میں یورپ کی ہر لغویت کھپ جائے۔ اور نئے جوانوں کی نفسانی خواہشات کو پورا کرے انھوں نے پھر اس بحث کو اس انداز سے نکالا کہ گویا وہ خود کوئی اپنی تحقیق پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ سب نقل مفتی عبدہ کے مذکورہ مقالہ کی ہے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس

بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جائے۔

اب الحمد للہ بقدر ضرورت اس کا بیان ہو گیا۔ اور اس کی پوری تفصیل میرے رسالہ "اسلامی ذبیحہ" میں ہے۔ وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسرا مسئلہ۔ اس جگہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے اس ارشاد میں ایک حکم جو مسلمانوں کے لئے بیان فرمایا کہ اہل کتاب کا طعام جو تمہارے لئے جائز ہے، یہ تو ظاہر ہے مگر اس کا دوسرا جزء یعنی مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لئے جائز ہے، اس کا کیا مقصد ہے۔ کیونکہ اہل کتاب جو قرآنی ارشادات کے قائل ہی نہیں، ان کے لئے کیا حلال ہے کیا حرام۔ اس کے بیان سے کیا فائدہ۔

تفسیر بحر محیط وغیرہ میں اس کے متعلق فرمایا کہ دراصل یہ حکم بھی مسلمانوں ہی کو بتلانا منظور ہے کہ تمہارا ذبیحہ ان کے لئے جائز ہے۔ اس واسطے تم اپنے ذبیحہ میں سے کسی غیر مسلم اہل کتاب کو کھلا دو تو کوئی گناہ نہیں۔ یعنی اپنی قربانی میں سے کسی کتابی شخص کو دے سکتے ہو۔ اور اگر ہمارا ذبیحہ ان کے لئے حرام ہوتا تو ہمارے لئے جائز نہ ہوتا کہ ہم ان کو اس میں سے کھلائیں۔ اس لئے گو یہ حکم بظاہر اہل کتاب کا ہے مگر درحقیقت اس کے مخاطب مسلمان ہی ہیں۔

اور تفسیر روح المعانی میں بحوالہ سدی اس جملہ کا ایک اور منشاء ذکر کیا ہے وہ یہ کہ اہل کتاب یہود ونصاریٰ کے مذہب میں بعض حلال جانور یا ان کے کچھ حصے سزا کے طور پر حرام کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے وہ جانور یا جانور کا حصہ طعام اہل کتاب میں بظاہر داخل نہیں، لیکن آیت کے اس جملہ نے بتلا دیا کہ جو جانور تمہارے لئے حلال ہے گو اہل کتاب اس کو حلال نہ جانتے ہوں، اگر اہل کتاب کے ذبح کردہ ملیں تو وہ بھی مسلمانوں کے لئے حلال ہی سمجھے جائیں گے۔ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس تقریر پر بھی آخر کار اس جملہ کا تعلق خود مسلمانوں کے ساتھ ہو گیا۔

اور تفسیر مظہری میں فرمایا کہ فائدہ اس جملہ کا فرق بیان کرنا ہے۔ ذبائح کے معاملہ میں اور نکاح کے معاملہ میں وہ فرق یہ ہے کہ ذبائح تو دونوں طرف سے حلال ہیں۔ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے اور مسلمانوں کا ذبیحہ اہل کتاب کے لئے۔ مگر عورتوں کے نکاح کا یہ معاملہ نہیں۔ اہل کتاب کی عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں۔ مگر مسلمانوں کی عورتیں اہل کتاب کے لئے حلال نہیں۔

تیسرا مسئلہ:۔ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں داخل نہیں۔ بلکہ وہ مرتد ہے، اس کا ذبیحہ باجماع امت حرام ہے۔

اسی طرح جو مسلمان ضروریات اور قطعیاتِ اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے مرتد ہوگیا ہے، اگرچہ وہ قرآن اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے کا دعویٰ بھی کرتا ہو وہ بھی مرتد ہے۔ اس کا ذبیحہ حلال نہیں۔ محض قرآن پڑھنے یا قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنے سے وہ اہلِ کتاب میں داخل نہیں ہوسکتا۔ ہاں کسی دوسرے مذہب وملت کا آدمی اگر اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی و نصرانی بن جائے تو وہ اہلِ کتاب میں شمار ہوگا۔ اور اس کا ذبیحہ حلال قرار پائے گا۔

آیت کا تیسرا جملہ یہ ہے:۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ط یعنی تمہارے لئے مسلمان عفیف و پاکدامن عورتوں سے نکاح حلال ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کی عفیف و پاکدامن عورتوں سے بھی نکاح حلال ہے۔

اس میں دونوں جگہ محصنٰت کا لفظ آیا ہے۔ جس کے معنی عربی لغت ومحاورہ کے اعتبار دو ہوسکتے ہیں۔ ایک آزاد جس کا مقابل کنیزیں ہیں۔ دوسرے عفیف و پاکدامن عورتیں ہیں لغت کے اعتبار سے اس جگہ بھی دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں۔

اسی لئے علماء تفسیر میں سے مجاہد نے اس جگہ محصنٰت کی تفسیر حرائر سے کی ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اہلِ کتاب کی آزاد عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں، کنیزیں حلال نہیں۔ (مظہری)

لیکن جمہور علماء صحابہ وتابعین کے نزدیک اس جگہ محصنٰت کے معنی عفیف و پاکدامن عورتوں کے ہیں اور مراد آیت کی یہ ہے کہ جس طرح عفیف اور پاکدامن مسلمان عورتوں سے نکاح جائز ہے اسی طرح اہلِ کتاب کی عفیف و پاکدامن عورتوں سے بھی جائز ہے۔

(احکام القرآن جصاص و مظہری)

لیکن باتفاق جمہور اس جگہ عفیف و پاکدامن عورتوں کی قید کے یہ معنی نہیں کہ غیر عفیف عورتوں سے نکاح ہی حرام ہے۔ بلکہ اس قید کا فائدہ بہتر اور مناسب صورت کی ترغیب ہے کہ خواہ مسلمان عورت سے نکاح کرو یا اہلِ کتاب سے۔ بہرحال یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ پاکدامن عفیف عورت سے نکاح ہو۔ بدکار فاسق عورتوں سے نکاح کا رشتہ جوڑنا کسی شریف مسلمان کا کام نہیں۔ (مظہری وغیرہ)

اس لئے خلاصۂ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ مسلمان کے لئے حلال ہے کہ کسی مسلمان

عورت سے نکاح کرے یا اہلِ کتاب کی عورت سے۔ البتہ دونوں صورتوں میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ عفیف و پاکدامن عورت سے نکاح کرے۔ بدکار، ناقابلِ اعتبار عورت سے نکاح کا رشتہ جوڑنا دین و دنیا دونوں کی تباہی ہے، اس سے بچنا چاہیئے۔ اس آیت میں اہلِ کتاب کی قید سے باجماعِ اُمت یہ ثابت ہوگیا کہ جو غیر مسلم اہلِ کتاب میں داخل نہیں، اُن کی عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔

سابقہ بیان میں یہ واضح ہوچکا کہ اس زمانہ میں جتنے فرقے اور جماعتیں غیر مسلموں کی موجود ہیں۔ ان میں صرف یہود و نصاریٰ ہی دو قومیں ہیں جو اہلِ کتاب میں شمار ہوسکتی ہیں۔ باقی موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اہلِ کتاب میں داخل نہیں۔ آتش پرست۔ بت پرست ہندو۔ سکھ آریہ۔ بدھ وغیرہ سب اسی عموم میں داخل ہیں۔ کیونکہ یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ اہلِ کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی ایسی کتاب کے ماننے والے اور اس کے اتباع کے دعویدار ہوں جس کا آسمانی کتاب اور وحیِ الٰہی ہونا قرآن وسنت کی نصوص سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ وہ تو توراۃ و انجیل ہی ہیں۔ جنکی ماننے والی کچھ قومیں اس وقت دنیا میں موجود ہیں، باقی زبور اور صحفِ ابراہیم علیہ السلام نہ کہیں محفوظ و موجود ہیں، نہ کوئی قوم ان کے اتباع کی دعویدار ہے اور "وید" اور "گرنتھ" یا زردشت وغیرہ ... کتابیں جو دنیا میں مقدس کہی جاتی ہیں ان کے وحیِ الٰہی اور آسمانی کتاب ہونے کا کوئی ثبوت کسی شرعی دلیل سے نہیں ہے۔ اور صرف یہ امکان کہ شاید زبور اور صحفِ ابراہیم ہی کی مسخ شدہ وہ صورت ہو جس کو بدھ مت کی کتاب یا "وید" یا گرنتھ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ امکان محض اور احتمال محض ہے۔ جو ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے باجماعِ اُمت ثابت ہوگیا کہ موجودہ زمانہ کے مختلف مذاہب میں سے صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح حلال ہے۔ اور کسی قوم کی عورت سے جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائے نکاح حرام ہے۔

آیت قرآنِ کریم وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ اسی مضمون کے لئے آئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائیں۔ اور اہلِ کتاب کے سوا دوسری قومیں سب مشرکات میں داخل ہیں۔

غرض قرآن مجید کی دو آیتیں اس مسئلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ایک میں یہ ہے کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح حلال نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائیں۔ دوسری یہ آیت سورۂ مائدہ کی جس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

اس لئے جمہور علماء صحابہ وتابعین نے دونوں آیتوں کا مدلول و مفہوم یہ قرار دیا کہ

کہ اصولی طور پر غیر مسلم عورت سے مسلمان کا نکاح نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن سورۃ مائدہ کی اس آیت نے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اس لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے سوا کسی دوسری قوم کی عورت سے بغیر اسلام لائے ہوئے مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

اب رہا مسئلہ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی عورتوں کا تو بعض صحابہ کرام کے نزدیک یہ بھی جائز نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہی مذہب ہے۔ اُن سے جب کوئی پوچھتا تو وہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد قرآن کریم میں واضح ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ یعنی مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو، جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑا کونسا شرک ہوگا کہ وہ عیسیٰ بن مریم یا کسی دوسرے بندہ خدا کو اپنا رب اور خدا قرار دے۔ (احکام القرآن۔ جصاص)

ایک مرتبہ میمون بن مہران نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کیا کہ ہم ایک ایسے ملک میں آباد ہیں جہاں اہلِ کتاب زیادہ رہتے ہیں۔ تو کیا ہم ان کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں اور ان کا ذبیحہ کھا سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو جواب میں یہ دونوں آیتیں پڑھ کر سُنا دیں۔ ایک وہ جس میں مشرکات کے نکاح کو حرام فرمایا ہے۔ دوسرے یہ آیت مائدہ جس میں اہلِ کتاب کی عورتوں کی حلت بیان کی ہے۔

میمون بن مہران نے کہا یہ دونوں آیتیں تو میں بھی قرآن میں پڑھتا ہوں اور جانتا ہوں۔ میرا سوال تو یہ ہے کہ ان دونوں کے پیشِ نظر میرے لئے حکم شرعی کیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے پھر یہی دونوں آیتیں پڑھ کر سُنا دیں۔ اور اپنی طرف سے کچھ نہیں فرمایا۔ جس کا مطلب علماء امت نے یہ قرار دیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح حلال ہونے پر کبھی اطمینان نہیں تھا۔

اور جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اگرچہ از روئے قرآن اہلِ کتاب کی عورتوں سے فی نفسہٖ نکاح حلال ہے، لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفاسد اور خرابیاں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بلکہ پوری امتِ اسلامیہ کے لئے از روئے تجربہ لازمی طور سے پیدا ہوں گی، ان کی بناء پر اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کو وہ بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

جصاص نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضؓ جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دیدو۔ حضرت حذیفہ رضؓ

نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ میرے لئے حرام ہے، تو پھر امیر المؤمنین فاروقِ اعظم رضؓ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاکدامنی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانہ میں اس راہ سے فحش و بدکاری داخل نہ ہو جائے۔ اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابوحنیفہؒ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری مرتبہ فاروق اعظم رضؓ نے جب حضرت حذیفہ رضؓ کو خط لکھا تو اس کے یہ الفاظ تھے:۔

اعزم علیك ان لا تضع كتابی حتّٰی تخلی سبیلها فانی اخاف ان یقتدیك المسلمون فیختاروا النساء اهل الذمة لجمالهن وكفیٰ بذلك فتنة لنساء المسلمین۔ (کتاب الآثار ص۱۵۶)	یعنی آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دیکر آزاد کر دو۔ کیونکہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ دوسرے مسلمان بھی آپ کی اقتدا کریں اور اہلِ ذمہ اہلِ کتاب کی عورتوں کو اُن کے حُسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگیں تو مسلمان عورتوں کے لئے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔

اس واقعہ کو نقل کر کے حضرت محمد بن حسن رحؒ نے فرمایا کہ فقہائے حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے، لیکن دوسرے مفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل کیا ہے کہ حذیفہ رضؓ کے علاوہ طلحہ اور کعب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انھوں نے آیت مائدہ کی بناء پر اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کر لیا تو جب فاروق اعظم رضؓ کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق دیدیں۔ (مظہری)

فاروق اعظم رضؓ کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ ہے۔ جب اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی، نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کر سکے۔ اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں اُن میں بدکاری ہو تو اُن کی وجہ سے ہمارے گھرانے گندے ہو جائیں۔ یا ان کے حُسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑ جائیں۔ مگر فاروقی نظر دُور بیں اتنے ہی مفاسد کو سامنے رکھ کر ان حضرات کو طلاق پر مجبور کرتی ہے۔ اگر آج کا نقشہ ان حضرات کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ اُن کا

اس کے متعلق کیا عمل ہوتا۔ اوّل تو وہ لوگ جو آج اپنے نام کے ساتھ مردم شماری کے رجسٹروں میں یہودی یا نصرانی لکھواتے ہیں۔ ان میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے عقیدہ کی رُو سے یہودیت و نصرانیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ نہ ان کا توراۃ و انجیل پر عقیدہ ہے نہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر۔ وہ عقیدہ کے اعتبار سے بالکل لامذہب اور اور دہریئے ہیں۔ محض قومی یا رسمی طور پر اپنے آپ کو یہودی اور نصرانی کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی عورتیں مسلمان کے لئے کسی طرح حلال نہیں۔ اور بالفرض اگر وہ اپنے مذہب کے پابند بھی ہوں تو ان کو کسی مسلمان گھرانہ میں جگہ دینا اپنے پورے خاندان کے لئے دینی اور دنیوی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں اس راہ سے اس آخری دور میں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں، جن کے عبرتناک روز آنکھوں کے سامنے آتے ہیں کہ ایک لڑکی نے پوری مسلم قوم اور سلطنت ..... کو تباہ کر دیا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ حلال و حرام سے قطع نظر بھی کوئی ذی ہوش انسان اسکے قریب جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

الغرض قرآن و سنت اور اسوۂ صحابہ کی رُو سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ آجکل کی کتابی عورتوں کو نکاح میں لانے سے کلی پرہیز کریں۔ آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو اگر رکھنا ہی ہے تو باقاعدہ نکاح کر کے بیوی کی حیثیت سے رکھیں، اُن کے حقوق مہر وغیرہ ادا کریں۔ ان کو داشتہ کے طور پر رکھنا اور کھلے طور پر بدکاری کرنا یہ سب چیزیں حرام ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا

اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو تو دھو لو

وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ

اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور مل لو اپنے سر کو

وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ

اور پاؤں ٹخنوں تک اور اگر تم کو جنابت ہو تو خوب طرح پاک ہو

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا کوئی تم میں آیا ہے جائے

۵

مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا

ضرور سے یا پاس گئے ہو عورتوں کے پھر نہ پاؤ تم پانی تو قصد کرو

صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا

مٹی پاک کا اور مل لو اپنے منہ اور ہاتھ اس سے اللہ

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ

نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی کرے ولیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے

وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶ وَاذْكُرُوْا

اور پورا کرے اپنا احسان تم پر تاکہ تم احسان مانو اور یاد کرو احسان

نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ

اللہ کا اپنے اوپر اور عہد اسکا جو تم سے ٹھہرایا تھا جب تم نے

قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ

کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ خوب جانتا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷

دلوں کی بات

ربطِ آیات پچھلی آیات میں کچھ احکام شرعیہ وہ ذکر کئے گئے جن کا تعلق انسان کی دنیوی زندگی اور کھانے پینے سے ہے۔ اس آیت میں چند احکام شرعیہ متعلق عبادات کے ذکر کئے گئے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھنے لگو (یعنی نماز پڑھنے کا ارادہ کرو اور تم کو اس وقت وضو نہ ہو) تو (وضو کر لو یعنی) اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت (دھوؤ) اور اپنے سروں پر بھیگا ہاتھ پھیرو۔ اور اپنے پیروں کو بھی ٹخنوں سمیت (دھوؤ) اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو (نماز سے پہلے) سارا بدن پاک کر لو اور اگر تم بیمار ہو (اور پانی کا استعمال مضر ہو) یا حالت سفر میں ہو (اور پانی نہیں ملتا جیسا آگے آتا ہے، یہ تو عذر کی حالت ہوئی) یا (اگر مرض و سفر کا عذر بھی نہ ہو بلکہ ویسے ہی وضو یا غسل ٹوٹ جاوے اس طرح سے کہ مثلاً) تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پاخانہ کے) استنجے سے (فارغ ہو کر) آیا ہو (جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو (جس سے غسل لوٹ گیا ہو

اور) پھر (ان ساری صورتوں میں) تم کو پانی (کے استعمال کا موقع) نہ ملے (خواہ بوجہ ضرر کے یا پانی نہ ملنے کے) تو (ان سب حالتوں میں) تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ اس زمین (کی جنس) پر سے (ہاتھ مار کر) اللہ تعالیٰ کو (ان احکام کے مقرر فرمانے سے) یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں (یعنی یہ منظور ہے کہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے، چنانچہ احکام مذکورہ میں خصوصاً اور جمیع احکام شرعیہ میں عموماً رعایت سہولت و مصلحت کی ظاہر ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم کو پاک صاف رکھے (اس لئے طہارت کے قواعد اور طرق مشروع کئے، اور کسی ایک طریق پر بس نہیں کیا گیا کہ اگر وہ نہ ہو تو طہارت ممکن ہی نہ ہو، مثلاً صرف پانی کو مطہر رکھا جاتا تو پانی نہ ہونے کے وقت طہارت حاصل نہ ہو سکتی، یہ طہارت ابدان تو خاص احکام طہارت ہی میں ہے۔ اور طہارت قلوب تمام طاعات میں عام ہے پس یہ تطہیر دونوں کو شامل ہے اور اگر یہ احکام نہ ہوتے تو کوئی طہارت حاصل نہ ہوتی۔) اور یہ (منظور ہے) کہ تم پر اپنا انعام تام فرما دے۔

(اس لئے احکام کی تکمیل فرمائی تاکہ ہر حال میں طہارت بدنی و قلبی جس کا ثمرہ رضاء قرب ہے جو اعظم نعم ہے حاصل کر سکو) تاکہ تم (اس عنایت کا) شکر ادا کرو (شکر میں امتثال بھی داخل ہے) اور تم لوگ اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو تم پر ہوا ہے یاد کرو، (جس میں بڑا انعام یہ ہے کہ تمہاری فلاح کے طریقے تمہارے لئے مشروع کر دئے) اور اس کے اس عہد کو بھی (یاد کرو) جس کا تم سے معاہدہ کیا ہے جبکہ تم نے (اس کا التزام بھی کر لیا تھا کہ عہد لینے کے وقت تم نے) کہا تھا کہ ہم نے (ان احکام کو) سنا اور مان لیا (کیونکہ اسلام لانے کے وقت ہر شخص اسی مضمون کا عہد کرتا ہے) اور اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لئے جو کام کرو اس میں اخلاص و اعتقاد بھی ہونا چاہیئے صرف منافقانہ امتثال کافی نہیں۔ مطلب یہ کہ ان احکام میں اول تو تمہارا ہی نفع پھر تم نے اپنے سر بھی رکھ لیا ہے۔ پھر مخالفت میں ضرر ان وجوہ سے امتثال ہی ضروری ہوا اور وہ بھی دل سے ہونا چاہیئے ورنہ مثل عدم امتثال ہی کے ہے)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ

اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو

بِالْقِسْطِ ۠ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا

انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو

تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ

عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہو

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ

اللہ سے اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو وعدہ کیا اللہ نے ایمان والوں

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ

سے اور جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے واسطے بخشش اور بڑا ثواب

عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ

ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور جھٹلائیں ہماری آیتیں وہ ہیں

اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

دوزخ والے

خلاصۂ تفسیر

(از:- بیان القرآن)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے (احکام کی) پوری پابندی کرنے والے (اور شہادت کی نوبت آوے تو) انصاف کی شہادت ادا کرنے والے رہو، اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم (ان کے معاملات میں) عدل نہ کرو (ضرور ہر معاملہ میں) عدل کیا کرو (یعنی عدل کرنا) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (یعنی اس سے تقویٰ کے ساتھ موصوف کہلاتا ہے) اور (تقویٰ اختیار کرنا تم پر فرض ہے، چنانچہ حکم ہوا ہے کہ) اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو۔ (یہی حقیقت ہے تقویٰ کی پس عدل جو کہ اس فرض تقویٰ کا موقوف علیہ ہے نیز فرض ہوگا) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے، (پس مخالفین احکام کو سزا ہو جاوے تو بعید نہیں) اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے جو ایمان لے آئے اور (انھوں نے) اچھے کام کئے وعدہ کیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور ثواب عظیم ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھوٹا بتلایا ایسے لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت کا مضمون تقریباً ان ہی الفاظ کے ساتھ سورۂ

نساء میں بھی گذر چکا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں کُونُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ ارشاد ہوا تھا اور یہاں كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ فرمایا گیا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں الفاظ کے تقدم اور تاخر کی ایک لطیف وجہ ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں ذکر کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

انسان کو عدل و انصاف سے روکنے اور ظلم و جور میں مبتلا کرنے کے عادتاً دو سبب ہوا کرتے ہیں ایک اپنے نفس یا اپنے دوستوں، عزیزوں کی طرفداری۔ دوسرے کسی شخص کی دشمنی و عداوت۔ سورۂ نساء کی آیت کا روئے سخن پہلے مضمون کی طرف ہے۔ اور سورۂ مائدہ کی اس آیت کا روئے سخن دوسرے مضمون کی طرف۔

اسی لئے سورۂ نساء میں اس کے بعد ارشاد ہے وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ یعنی عدل و انصاف پر قائم رہو۔ چاہے وہ عدل و انصاف کا حکم خود تمہارے نفوس یا تمہارے والدین اور عزیزوں و دوستوں کے خلاف پڑے۔ اور سورۂ مائدہ کی اس آیت میں جملۂ مذکور کے بعد یہ ارشاد ہے۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ یعنی کسی قوم کی عداوت و دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف کے خلاف کرنے لگو۔

اس لئے سورۂ نساء کی آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں اپنے نفس اور والدین اور عزیزوں کی بھی پرواہ نہ کرو۔ اگر انصاف کا حکم . . . ان کے خلاف ہے تو خلاف ہی پر قائم رہو۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی دشمن کی دشمنی کی وجہ سے لغزش نہ ہونی چاہیے کہ اس کو نقصان پہنچانے کے لئے خلافِ انصاف کام کرنے لگو۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ نساء کی آیت میں قسط یعنی انصاف کو مقدم کر کے ارشاد فرمایا، كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت میں لِلّٰهِ کو مقدم کر کے ارشاد فرمایا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ اگرچہ انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے یہ دونوں عنوان ایک ہی مقصد کو ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص انصاف پر کھڑا ہوگا، وہ اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوگا۔ اور جو شخص اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ ضرور انصاف ہی کرے گا۔ لیکن اپنے نفس اور دوستوں عزیزوں کی رعایت کے مقام میں یہ خیال گزر سکتا ہے کہ ان تعلقات کی رعایت بھی تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس لئے وہاں لفظِ قسط کو مقدم لا کر اس کی طرف ہدایت کر دی کہ وہ رعایت اللہ کے لئے نہیں ہو سکتی جو عدل و انصاف

کے خلاف ہو۔ اور سورۂ مائدہ میں دشمنوں کے ساتھ عدل و انصاف برتنے کا حکم دینا تھا تو وہاں لفظ لِلّٰهِ کو مقدم لا کر انسانی فطرت کو جذبات میں مغلوب ہونے سے نکال دیا۔ کہ تم لوگ اللہ کے لئے کھڑے ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرو۔

خُلاصہ یہ ہے کہ سورۂ نساء اور مائدہ کی دونوں آیتوں میں دو چیزوں کی طرف ہدایت ہے۔ ایک یہ کہ خواہ معاملہ دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے عدل و انصاف کے حکم پر قائم رہو۔ نہ کسی تعلق کی رعایت سے اس میں کمزوری آنی چاہیئے اور نہ کسی دشمنی و عداوت سے۔ دوسری ہدایت اِن دونوں آیتوں میں اس کی بھی ہے کہ سچی شہادت اور حق بات کے بیان کرنے سے پہلوتہی نہ کی جائے۔ تاکہ فیصلہ کرنے والوں کو حق اور صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

قرانِ کریم نے اس مضمون پر کئی آیتوں میں مختلف عنوانات سے زور دیا ہے اور اس کی تاکید فرمائی ہے کہ لوگ سچی گواہی دینے میں کوتاہی اور سستی نہ برتیں۔ ایک آیت میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حکم دیا

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔

یعنی گواہی کو چھپاؤ نہیں اور جو شخص چھپائے گا اس کا دِل گنہگار ہوگا۔ جس سے سچی گواہی دینا واجب اور اس کا چھپانا سخت گناہ ثابت ہوا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآنِ حکیم نے اس پر بھی نظر رکھی ہے کہ لوگوں کو سچی گواہی دینے سے روکنے والی چیز دراصل یہ ہے کہ گواہ کو بار بار عدالتوں کی حاضری اور فضول قسم کی جرح سے سابقے پڑتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کا نام کسی گواہی میں آگیا وہ ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے کاروبار سے گیا، اور مفت کی زحمت میں مبتلا ہوا۔

اِس لئے قرآنِ کریم نے جہاں سچی گواہی دینے کو لازم و واجب قرار دیا، وہیں یہ بھی ارشاد فرما دیا۔ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ۔ یعنی معاملہ کی تحریر لکھنے والوں اور گواہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

آج کی عدالتوں اور ان میں پیش ہونے والے مقدمات کی اگر صحیح تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ موقع کے اور سچے گواہ شاذ و نادر کہیں ملتے ہیں۔ سمجھدار شریف آدمی جہاں کوئی ایسا واقع دیکھتا ہے وہاں سے بھاگتا ہے کہ کہیں گواہی میں نام نہ آجائے۔ پولیس اِدھر اُدھر کے گواہوں سے خانہ پُری کرتی ہے۔ اور نتیجہ اس کا وہی ہو سکتا ہے جو رات دن مشاہدہ میں آرہا ہے کہ فیصد دس پانچ مقدمات میں بھی حق و انصاف پر فیصلہ نہیں ہو سکتا اور

عدالتیں بھی مجبور ہیں، جیسی شہادتیں اُن کے پاس پہنچتی ہیں وہ انہی کے ذریعہ کوئی نتیجہ نکال سکتی ہیں اور انھیں کی بنیاد پر فیصلہ کرسکتی ہیں۔

مگر اس بنیادی غلطی کو کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ اگر گواہوں کے ساتھ شریفانہ معاملہ کیا جائے اور ان کو بار بار پریشان نہ کیا جائے تو اچھے بھلے نیک اور سچے آدمی قرآنی تعلیمات کے پیش نظر گواہی میں آنے سے باز نہ رہیں گے۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ کی ابتدائی تحقیق جو پولیس کرتی ہے وہ ہی بار بار بلاکر گواہ کو اتنا پریشان کردیتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی اولاد کو کہہ مرتا ہے کہ کبھی کسی معاملہ کے گواہ نہ بننا۔ پھر اگر معاملہ عدالت میں پہنچتا ہے تو وہاں تاریخوں پر تاریخیں لگتی ہیں۔ ہر تاریخ پر اس ناکردہ گناہ گواہ کو حاضری کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس طولانی ضابطہ کارروائی نے جو انگریز اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے، ہماری ساری عدالتوں اور محکموں کو گندہ کیا ہوا ہے۔ قدیم سادہ طرز پر جو آج بھی حجاز اور بعض دوسرے ممالک میں رائج ہے نہ مقدمات کی اتنی کثرت ہوسکتی ہے اور نہ ان میں اتنا طول ہوسکتا ہے نہ گواہوں کو گواہی دینا مصیبت بن سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ضابطہ شہادت اور ضابطہ کارروائی اگر قرآنی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے تو اس کی برکات آج بھی آنکھوں سے مشاہدہ ہونے لگیں۔ قرآن نے ایک طرف واقعہ سے باخبر لوگوں پر سچی شہادت ادا کرنے کو لازم و واجب قرار دے دیا ہے۔ تو دوسری طرف لوگوں کو ایسی ہدایتیں دیدی ہیں کہ گواہوں کو بلاوجہ پریشان نہ کیا جائے۔ کم سے کم وقت میں ان کا بیان لیکر فارغ کردیا جائے ـــــــــ

امتحانات کے نمبر، سند و سارٹیفکٹ اور انتخابات کے ووٹ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں۔

آخر میں ایک اور اہم بات بھی یہاں جاننا ضروری ہے، وہ یہ کہ لفظ شہادت اور گواہی کا جو مفہوم آج کل عُرف میں مشہور ہوگیا ہے وہ تو صرف مقدمات و خصومات میں کسی حاکم کے سامنے گواہی دینے کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ مگر قرآن و سنّت کی اِصطلاح میں لفظ شہادت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ مثلاً کسی بیمار کو ڈاکٹری سارٹیفکٹ دینا کہ یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل نہیں یا نوکری کرنے کے قابل نہیں۔ یہ بھی ایک شہادت ہے۔ اگر اس میں واقعہ کے خلاف لکھا گیا تو وہ جھوٹی شہادت ہوکر گناہ کبیرہ ہوگیا۔

اِسی طرح امتحانات میں طلبا کے پرچوں پہ نمبر لگانا بھی ایک شہادت ہے۔ اگر جان

بوجھ کر یا بے پروائی سے نمبروں میں کمی بیشی کردی تو وہ بھی جھوٹی شہادت ہے۔ اور حرام اور سخت گناہ ہے۔

کامیاب ہونے والے فارغ التحصیل طلبا کو سند یا سارٹیفکٹ دینا اس کی شہادت ہے کہ وہ متعلقہ کام کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر وہ شخص واقع میں ایسا نہیں ہے تو اس سارٹیفکٹ یا سند پر دستخط کرنے والے سب کے سب شہادت کاذبہ کے مجرم ہوجاتے ہیں۔

اسی طرح اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے انتخاب میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت ہے۔ جس میں ووٹ دہندہ کی طرف سے اس کی گواہی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ شخص اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے بھی اور دیانت و امانت کے اعتبار سے بھی قومی نمائندہ بننے کے قابل ہے۔

اب غور کیجئے کہ ہمارے نمایندوں میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کے حق میں یہ گواہی سچی اور صحیح ثابت ہوسکے۔ مگر ہمارے عوام ہیں کہ انھوں نے اس کو محض ہار جیت کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے ووٹ کا حق کبھی پیسوں کے عوض میں فروخت ہوتا ہے، کبھی کسی دباؤ کے تحت استعمال کیا جاتا ہے، کبھی ناپائدار دوستوں اور ذلیل وعدوں کے بھروسہ پر اسکو استعمال کیا جاتا ہے۔

اور تو اور لکھے پڑھے دیندار مسلمان بھی نااہل لوگوں کو ووٹ دیتے وقت کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم یہ جھوٹی گواہی دے کر مستحق لعنت و عذاب بن رہے ہیں۔

نمائندوں کے انتخاب کے لئے ووٹ دینے کی از روئے قرآن ایک دوسری حیثیت بھی ہے جس کو شفاعت یا سفارش کہا جاتا ہے کہ ووٹ دینے والا گویا یہ سفارش کرتا ہے فلاں امیدوار کو نمائندگی دی جائے۔ اس کا حکم قرآن کریم کے الفاظ میں پہلے بیان ہوچکا ہے، ارشاد ہے:-

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا۔

یعنی جو شخص اچھی اور سچی سفارش کرے گا، تو جس کے حق میں سفارش کی ہے اس کے نیک عمل کا حصّہ اس کو بھی ملے گا۔ اور جو شخص بُری سفارش کرتا ہے، یعنی کسی نااہل اور برے شخص کو کامیاب بنانے کی سعی کرتا ہے، اس کو اس کے بُرے اعمال کا حِصّہ ملے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ امیدوار اپنی کارکردگی کے پنج سالہ دَور میں غلط اور ناجائز

کام کرے گا، اِن سب کا وبال ووٹ دینے والے کو بھی پہونچے گا۔

ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس اُمیدوار کو اپنی نمائندگی کے لئے وکیل بناتا ہے۔ لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہونچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں۔ کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دیکر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خُلاصہ یہ کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت، دوسرے شفاعت اور تیسرے حقوقِ مشترکہ میں وکالت۔ تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک صالح قابل آدمی کو ووٹ دینا موجبِ ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں۔ اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بُری شفاعت بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

اس لئے ہر مسلمان ووٹر پر فرض ہے کہ ووٹ دینے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرلے کہ جس کو ووٹ دے رہا ہے وہ کام کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں اور دیانت دار ہے یا نہیں، محض غفلت و بے پرواہی سے بلا وجہ ان عظیم گناہوں کا مرتکب نہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اے ایمان والو یاد رکھو احسان اللہ کا اپنے اوپر

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ

جب قصد کیا لوگوں نے کہ تم پر ہاتھ چلا دیں پھر روک دیئے تم سے

اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

اُن کے ہاتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ ہی پر چاہیے بھروسہ

الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ

ایمان والوں کو اور لے چکا ہے اللہ عہد بنی اسرائیل سے

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ

اور مقرر کئے ہم نے ان میں بارہ سردار اور کہا اللہ نے میں تمہارے

مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ

ساتھ ہوں اگر تم قائم رکھو گے نماز اور دیتے رہو گے زکوٰۃ اور یقین لاؤ گے

بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا

میرے رسولوں پر اور مدد کرو گے ان کی اور قرض دو گے اللہ کو اچھی طرح کا قرض

لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ

تو البتہ دور کردوں گا میں تم سے گناہ تمہارے اور داخل کروں گا تم کو باغوں میں

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ

کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں پھر جو کوئی کافر ہوا تم میں سے

مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝۱۲

اس کے بعد تو وہ بیشک گمراہ ہوا سیدھے راستے سے۔

خُلاصۂ تفسیر

(از بیان القرآن)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرو جو تم پر ہوا ہے، جب کہ ایک قوم (یعنی کفارِ قریش ابتدائے اسلام میں جب کہ مسلمان ضعیف تھے) اس فکر میں تھے کہ تم پر (اس طرح) دست درازی کریں (کہ تمہارا خاتمہ ہی کردیں) سو اللہ تعالیٰ نے ان کا قابو تم پر (اس قدر) نہ چلنے دیا (اور آخر میں تم کو غالب کردیا۔ پس اس نعمت کو یاد کرو) اور (احکام کے امتثال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرو (کہ اس نعمت کا یہ شکریہ ہے) اور (آئندہ بھی) اہلِ ایمان کو حق تعالیٰ پر اعتماد رکھنا چاہیے (جس نے پہلے تمہارے سب کام بنائے ہیں) آئندہ بھی آخرت تک امید رکھو اتقوا اللہ میں خوف دلایا اور امر بالتوکل میں امید اور یہی دو عمل معین امتثال ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے (حضرت موسیٰ کے واسطے سے) بنی اسرائیل سے (بھی) عہد لیا تھا (جس کا بیان عنقریب آتا ہے) اور (ان عہود کی تاکید کے لئے) ہم نے ان میں سے (موافق عدد ان کے قبائل کے) بارہ سردار مقرر کئے (کہ ہر ہر قبیلہ پر ایک ایک سردار رہے جو اپنے ماتحتوں پر ہمیشہ ایفاء عہود کی تاکید رکھے) اور (مزید تاکید عہد کے لئے اُن سے) اللہ تعالیٰ نے یوں (بھی) فرمادیا کہ میں تمہارے پاس ہوں (تمہارے بُرے بھلے کی سب مجھ کو خبر رہے گی، مطلب یہ ہے کہ عہد لیا پھر اس کی تاکید در تاکید فرمائی اور اس عہد کا خلاصۂ مضمون یہ تھا کہ) اگر تم نماز کی پابندی رکھو گے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے اور میرے سب رسولوں پر (جو آئندہ بھی نئے نئے آتے رہیں گے) ایمان لاتے رہو گے اور (دشمنوں کے مقابلہ میں) ان کی مدد

مدد کرتے رہو گے اور (علاوہ زکوٰۃ کے اور مصارف خیر میں بھی صرف کرکے) اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر (یعنی اخلاص کے ساتھ) قرض دیتے رہو گے تو میں ضرور تمھارے گناہ تم سے دُور کر دوں گا اور ضرور تم کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے (محلات کے) نیچے کو نہریں جاری ہوں گی اور جو شخص اُس (عہد و پیمان لینے) کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہ بے شک راہِ راست سے دُور جا پڑا۔

معارف و مسائل

سورۂ مائدہ کی ساتویں آیت جو پہلے گزر چکی ہے، اس میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے ایک عہد و میثاق لینے اور ان کے ماننے اور تسلیم کر لینے کا ذکر فرمایا ہے۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ یہ میثاق خدا اور رسول کی اطاعت اور احکام شرعیہ کے اتباع کا میثاق ہے۔ جس کا اصطلاحی عنوان کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے۔ اور ہر کلمہ گو مسلمان اِس میثاق کا پابند ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں میثاق کی بعض اہم دفعات یعنی خاص خاص احکام شرعیہ کا بیان فرمایا ہے جس میں دوست دشمن سب کے لئے عدل و انصاف کے قیام کی اور اقتدار پانے کے بعد دشمنوں سے جذبۂ انتقام کے بجائے انصاف اور رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ میثاق خود بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا انعام ہے، اسی لئے اُس کو اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ سے شروع کیا گیا ہے۔

آیتِ مذکورہ کو پھر اسی جملہ اُذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ سے شروع کرکے یہ بتلانا منظور ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اس عہد و میثاق کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا و آخرت میں قوت و بلندی اور درجاتِ عالیہ عطاء فرمائے اور دشمنوں کے ہر مقابلہ میں اُنکی امداد فرمائی۔ دشمنوں کا قابو ان پر نہ چلنے دیا۔

اس آیت میں خاص طور پر اُس کا ذکر ہے کہ دشمنوں نے بارہا رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مٹا دینے اور قتل و غارت کر دینے کے منصوبے بنائے، اور تیاریاں کیں، مگر اللہ تعالیٰ نے سب کو خائب و خاسر کر دیا۔ ارشاد ہے کہ "ایک قوم اس فکر میں تھی کہ تم پر دست درازی کرے، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُن کے ہاتھ تم سے روک دیئے"

مجموعی حیثیت سے تو ایسے واقعات تاریخ اسلام میں بے شمار ہیں کہ کفار کے منصوبے بفضلِ خداوندی سے خاک میں مل گئے۔ لیکن بعض خاص خاص اہم واقعات بھی ہیں جن کو حضراتِ مفسرین نے اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔ مثلاً مسندِ عبد الرزاق میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

کسی جہاد میں رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام ایک منزل پر قیام پذیر ہوئے صحابۂ کرام مختلف حصّوں میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر آرام کرنے لگے۔ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم تن تنہا ایک درخت کے نیچے ٹھہر گئے۔ اور اپنے ہتھیار ایک درخت پر لٹکا دیئے ــــ دشمنوں میں سے ایک گاؤں والا موقع غنیمت جان کر جھپٹا اور آتے ہی رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تلوار پر قبضہ کر لیا۔ اور آپؐ کو وہ تلوار کھینچ کر بولا مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ اب بتلایئے کہ آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔

رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بے دھڑک فرمایا کہ "اللہ عزّ وجل" گاؤں والے نے پھر وہی کلمہ دہرایا۔ مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ آپؐ نے پھر اسی بے فکری کے ساتھ فرمایا "اللہ عزّ وجل"۔ دو تین مرتبہ اسی طرح کی گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ غیبی قدرت کے رعب نے اس کو مجبور کر دیا کہ تلوار کو میان میں داخل کر کے رکھ دیا۔ اس وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بلایا اور یہ واقعہ سُنایا۔ یہ گاؤں والا ابھی تک آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، آپؐ نے اس کو کچھ نہیں کہا۔ (ابن کثیر)

اسی طرح بعض صحابہ رضؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ کعب بن اشرف یہودی نے ایک مرتبہ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں بُلا کر قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس کی اطلاع کر دی اور ان کی ساری سازش خاک میں مل گئی (ابن کثیر) اور حضرتِ مجاہد، عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ کے لئے یہود بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیوار کے نیچے بٹھا کر باتوں میں مشغول کیا اور دوسری طرف عمرو بن جحش کو اس کام پر مقرر کر دیا کہ دیوار کے پیچھے سے اوپر چڑھ کر پتھر کی ایک چٹان آپؐ کے اوپر ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کے ارادہ پر مطلع فرمایا اور آپؐ فوراً وہاں سے اُٹھ گئے۔ (ابن کثیر)

ان واقعات میں کوئی تضاد نہیں، سب کے سب آیتِ مذکورہ کا مصداق ہو سکتے ہیں۔ آیتِ مذکورہ میں رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی غیبی حفاظت کا ذکر کرنے

کے بعد فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

اس میں ایک ارشاد تو یہ ہے کہ یہ انعامِ خداوندی صرف رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس نصرت و امداد اور غیبی حفاظت کا اصلی سبب تقویٰ اور توکل ہے۔ جو قوم یا فرد جس زمانہ اور جس مکان میں ان دو وصفوں کو اختیار کرے گا اس کی بھی ایسی ہی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت و حمایت ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جملہ کو آیاتِ سابقہ کے مجموعہ کے ساتھ لگایا جائے۔ جن میں بدترین دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور عدل و انصاف کے احکام دیے گئے ہیں تو پھر اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہوگا کہ ایسے سخت دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور رواداری کی تعلیم بظاہر ایک سیاسی غلطی اور دشمنوں کو جرأت و ہمت دلانے کے مرادف ہے، اس لئے اس جملہ میں مسلمانوں کو اس پر متنبہ کیا گیا کہ اگر تم تقویٰ شعار اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے رہو تو یہ رواداری اور حسنِ سلوک تمہارے لئے قطعاً مضر نہیں ہوگا، اور دشمنوں کو مخالفت کی جرأت کے بجائے تمہارے زیر اثر لانے اور اسلام سے قریب کرنے کا سبب ہے گا۔ نیز تقویٰ اور خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کو عہد و میثاق کی پابندی پر ظاہراً و باطناً مجبور کر سکتا ہے۔ جہاں یہ تقویٰ یعنی خوفِ خدا نہیں ہوتا وہاں عہد و میثاق کا وہی حشر ہوتا ہے جو آجکل عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے، اس لئے اوپر کی جس آیت میں میثاق کا ذکر ہے وہاں بھی آخر آیت میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ فرمایا گیا تھا۔ اور یہاں پھر اس کا اعادہ کیا گیا، نیز اس پوری آیت میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی فتح و نصرت صرف ظاہری ساز و سامان کی مرہونِ منت نہیں ہے، بلکہ ان کی اصل طاقت کا راز تقویٰ اور توکل میں مضمر ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں سے عہد و میثاق لینے اور ان کے ایفاء عہد پر دنیا و آخرت میں اس کے بیش بہا نتائج کا ذکر کرنے کے بعد معاملہ کا دوسرا رخ سامنے لانے کے لئے دوسری آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ عہد و میثاق لینا صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ اُن سے پہلے دوسری امتوں سے بھی اسی قسم کے میثاق لئے گئے تھے۔ مگر وہ اپنے عہد و میثاق میں پورے نہ اترے۔ اس لئے ان پر طرح طرح کے عذاب مسلط کئے گئے۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی ایک عہد لیا تھا۔ اور ان سے عہد لینے کی یہ صورت اختیار کی گئی تھی کہ پوری قوم بنی اسرائیل جو بارہ خاندانوں پر مشتمل تھی انھیں سے ہر خاندان سے

ایک سردار چنا گیا، اور ہر خاندان کی طرف سے اس کے ہر سردار نے ذمہ داری اٹھائی کہ میں اور میرا پورا خاندان اس میثاقِ الٰہی کی پابندی کرے گا۔ اس طرح ان بارہ سرداروں نے پوری قوم بنی اسرائیل کی ذمہ داری لے لی۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ خود بھی اس میثاق کی پابندی کریں۔ اور اپنے خاندان سے بھی کرائیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عزت و فضیلت کے معاملہ میں اسلام کا اصل اصول تو یہ ہے کہ ؎

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں پوری وضاحت کے ساتھ اس کا اعلان فرما دیا ہے کہ اسلام میں عرب و عجم، کالے، گورے اور اونچی نیچی ذات، پات کا کوئی اعتبار نہیں۔ جو اسلام میں داخل ہو گیا وہ سارے مسلمانوں کا بھائی ہو گیا۔ حسب، نسب، رنگ، وطن، زبان کے امتیازات جو جاہلیت کے بت تھے ان سب کو اسلام نے توڑ ڈالا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ انتظامی معاملات میں نظم قائم رکھنے کے لئے بھی خاندانی خصوصیات کا لحاظ نہ کیا جائے۔

یہ فطری امر ہے کہ ایک خاندان کے لوگ اپنے خاندان کے جانے پہچانے آدمی پر بہ نسبت دوسروں کے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں۔ اور یہ شخص ان کی پوری نفسیات سے واقف ہونے کی بنا پر ان کے جذبات و خیالات کی زیادہ رعایت کر سکتا ہے۔ اسی حکمتِ عملی پر مبنی تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں سے جب عہد لیا گیا تو ہر خاندان کے ایک ایک سردار کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

اور اسی انتظامی مصلحت اور مکمل اطمینان و سکون کی رعایت اس وقت بھی کی گئی، جبکہ قوم بنی اسرائیل پانی نہ ہونے کی وجہ سے سخت اضطراب میں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور بحکم خداوندی انھوں نے اپنا عصا ایک پتھر پر مارا تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھر سے بارہ چشمے بارہ خاندانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ جاری کر دئے۔

سورۂ اعراف میں قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کا اس طرح ذکر فرمایا ہے:۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا۔ اور فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ط

ہم نے بانٹ دیئے ان کے بارہ خاندان بارہ جماعتوں میں۔ پھر پھوٹ نکلے پتھر سے بارہ چشمے (ہر ایک خاندان کے لئے جدا جدا)۔

اور یہ بارہ کا عدد بھی کچھ عجیب خصوصیت اور مقبولیت رکھتا ہے۔

جس وقت انصار مدینہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے لئے دعوت دینے حاضر ہوئے اور آپ نے اُن سے بذریعہ بیعت معاہدہ لیا تو اس معاہدہ میں بھی انصار کے بارہ سرداروں نے ذمہ داری لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی اُن میں تین سردار قبیلہ اوس کے اور نو قبیلہ خزرج کے تھے۔ (ابن کثیر)

اور صحیحین میں حضرت جابر بن سمرۃ رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کا کام اور نظام اس وقت تک چلتا رہے گا، جب تک کہ بارہ خلیفہ ان کی قیادت کریں گے۔ امام ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا کہ اس حدیث کے کسی لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ بارہ امام یکے بعد دیگرے مسلسل ہوں گے۔ بلکہ ان کے درمیان فاصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ چار خلفاء صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ رضی اللہ عنہم مسلسل ہوئے اور درمیان کی کچھ مدت کے بعد پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز باجماعِ امت پانچویں خلیفہ برحق مانے گئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے معاہدہ لینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارہ خاندانوں کے بارہ سرداروں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور اُن سے ارشاد فرمایا۔ اِنِّیْ مَعَكُمْ یعنی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے میثاق کی پابندی کی اور دوسروں سے پابندی کرانے کا عزم کیا تو میری امداد و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد آیت مذکورہ میں اس میثاق کی چند اہم دفعات اور بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور ان پر عذابِ الٰہی کا ذکر ہے۔

میثاق کی دفعات کا ذکر کرنے سے پہلے ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ۔ اِنِّیْ مَعَكُمْ۔ جس میں دو باتیں بتلادی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر تم میثاق پر قائم رہے تو میری امداد تمہارے ساتھ رہے گی۔ اور تم ہر قدم پر اس کا مشاہدہ کرو گے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے، اور اس میثاق کی نگرانی فرما رہا ہے، تمہارا کوئی عزم و ارادہ، اور فکر و خیال یا حرکت و عمل اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ وہ تمہاری خلوتوں کے رازوں کو بھی دیکھتا اور سنتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں کی نیتوں اور ارادوں سے بھی واقف ہے۔ میثاق کی خلاف ورزی کرکے تم کسی طرح بھی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اس کے بعد میثاق کی دفعات میں سب سے پہلے اقامتِ صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور پھر ادائے زکوٰۃ کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ کے فرائض اسلام سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر بھی عائد تھے۔ اور دوسرے قرآنی اشارات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرائض صرف بنی اسرائیل ہی کے ساتھ مخصوص نہیں

بلکہ ہر پیغمبر اور ہر شریعت میں ہمیشہ عائد رہے ہیں۔ تیسرا نمبر میثاق میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب رسولوں پر ایمان لائیں اور اُن کے مقصد رشد و ہدایت میں ان کی امداد کریں —

بنی اسرائیل میں چونکہ بہت سے رسول آنے والے تھے، اس لئے ان کو خصوصیت سے اس کی تاکید فرمائی گئی۔ اور اگرچہ ایمانیات کا درجہ عملیات، نماز، زکوٰۃ سے رُتبۃً مقدم ہے۔ مگر میثاق میں مقدم اس کو رکھا گیا جس پر بالفعل عمل کرنا تھا۔ آنے والے رسول تو بعد میں آئیں گے، اُن پر ایمان لانے اور ان کی امداد کرنے کا وقوع بھی بعد میں ہونے والا تھا اس لئے اس کو مؤخر بیان فرمایا گیا۔

چوتھا نمبر میثاق میں یہ ہے کہ۔ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (یعنی تم اللہ تعالیٰ کو قرض دو، اچھی طرح کا قرض)۔ اچھی طرح کے قرض کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو، کوئی دنیوی غرض اس میں شامل نہ ہو، اور اللہ کی راہ میں اپنی محبوب چیز خرچ کرے۔ ردّی اور بیکار چیزیں دے کر نہ ٹالے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرض دینے سے اسلئے تعبیر کیا گیا ہے کہ قرض کا بدلہ قانوناً و عرفاً اور اَخلاقاً واجب الادا سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ یقین کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں خرچ کریں کہ اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔

اور زکوٰۃ فرض کا ذکر مستقلاً کرنے کے بعد اس جگہ قرضِ حسن کا ذکر یہ بتلا رہا ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات و خیرات ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان صرف زکوٰۃ اَدا کرکے ساری مالی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوجاتا۔ زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ اور مالی حقوق انسان کے ذمہ لازم ہیں۔ کسی جگہ مسجد نہیں تو تعمیر مسجد اور دینی تعلیم کے لئے حکومت متکفل نہیں ہے تو دینی تعلیم کا انتظام مسلمانوں ہی پر لازم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ فرضِ عین اور یہ فرض کفایہ ہیں۔

فرض کفایہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ قوم کے چند افراد یا کسی جماعت نے ان ضرورتوں کو پورا کر دیا تو دوسرے مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اگر کسی نے بھی نہ کیا تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔ آجکل دینی تعلیم اور اُس کے مدارس جس کسمپرسی اور بےکسی کے عالم میں ہیں اُن کو وہی لوگ جانتے ہیں، جنھوں نے اس کو دین کی اہم خدمت سمجھ کر قائم کیا ہوا ہے۔ زکوٰۃ اَدا کرنے کی حد تک مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے ذمہ فرض ہے۔ اور یہ جاننے کے باوجود بہت کم افراد ہیں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور ادا کرنے والوں میں بھی بہت کم افراد ہیں جو پورا حساب کرکے پوری زکوٰۃ اَدا کرتے ہیں، اور جو خال خال پوری زکوٰۃ ادا کرنے والے بھی ہیں تو وہ بالکل یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اب ہمارے ذمہ اور کچھ نہیں۔ ان کے سامنے مسجد کی ضرورت آتی تو زکوٰۃ

معارف و مسائل

آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی بدبختی سے ان واضح ہدایات پر کان نہ دھرے اور میثاق کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر دیا۔

بنی اسرائیل پر ان کی بدعملی اور سرکشی کی سزا میں دو طرح کے عذاب آئے۔ ایک ظاہری اور محسوس جیسے پتھراؤ یا زمین کا تختہ الٹ دینا وغیرہ جن کا ذکر قرآن کریم کی آیات میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔

دوسری قسم عذاب کی معنوی اور روحانی ہے کہ سرکشی کی سزا میں ان کے دل و دماغ مسخ ہوگئے۔ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہی۔ وہ اپنے گناہوں کے وبال میں مزید گناہوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔

ارشاد ہے:۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً۔ یعنی ہم نے ان کی بدعہدی اور میثاق کی خلاف ورزی کی سزا میں ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا، اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا کہ اب ان میں کسی چیز کی گنجائش نہ رہی۔ اسی رحمت سے دوری اور دلوں کی سختی کو قرآن کریم نے سورۂ مطففین میں رَانَ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ یعنی قرآنی آیات بینات اور کھلی ہوئی نشانیوں سے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے گناہوں کی وجہ سے زنگ بیٹھ گیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ

انسان جب اوّل کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، جس کی برائی کو وہ ہر وقت ایسا محسوس کرتا ہے جیسے کسی صاف سفید کپڑے پر ایک سیاہ داغ لگ جائے وہ ہر وقت نظر کو تکلیف دیتا ہے۔ پھر اگر اس نے متنبہ ہو کر توبہ کر لی اور آئندہ گناہ سے باز آگیا تو وہ نقطہ مٹا دیا جاتا ہے۔ اور اگر اس نے پروا نہ کی بلکہ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا تو ہر گناہ پر ایک نقطہ سیاہ کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کا صفحۂ قلب ان نقطوں سے بالکل سیاہ ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے قلب کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے کوئی برتن اوندھا رکھا ہو کہ اس میں کوئی چیز ڈالی جائے تو فوراً باہر آجاتی ہے، اس لئے کوئی خیر اور نیکی کی بات اس کے دل میں نہیں جمتی، اس وقت اس کے دل کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ۔ لا يعرف معروفا ولا ينكر منكرا۔ یعنی اب نہ وہ کسی نیکی کو نیکی سمجھتا ہے نہ برائی کو برائی

؎ پہلے ایڈیشنوں میں یہاں عبارت یوں تھی: "جیسے ان پر خون اور مینڈکوں وغیرہ کی بارش یا پتھراؤ" لیکن بعض اہل علم نے توجہ دلائی کہ خون اور مینڈکوں کا عذاب بنی اسرائیل پر نہیں آیا تھا، اس لئے یہاں سے خون اور مینڈکوں کا ذکر حذف کر دیا گیا۔ حضرت مصنفؒ کی طرف سے احقر کو ایسے تصرفات کی اجازت تھی ۱۲ احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ ۸-۷-۱۴۰۹ھ

بلکہ معاملہ برعکس ہونے لگتا ہے کہ عیب کو ہنر، بدی کو نیکی، گناہ کو ثواب سمجھنے لگتا ہے۔ اور اپنی طغیانی اور سرکشی میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ اس کے گناہ کی نقد سزا ہے جو اس کو دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔

بعض اکابر نے فرمایا ہے۔ ان من جزاء الحسنة الحسنة بعدها وان من جزاء السيئة السيئة بعدها۔ یعنی نیکی کی ایک نقد جزاء یہ ہے کہ اس کے بعد اس کو دوسری نیکی کی توفیق ہوتی ہے۔ اسی طرح گناہ کی نقد سزا یہ ہے کہ ایک گناہ کے بعد اس کا دل دوسرے گناہوں کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ معلوم ہوا کہ طاعات اور معاصی میں تجاذب ہے کہ ؎

زر زر کشد در جہاں گنج گنج

ایک نیکی دوسری نیکی کو دعوت دیتی ہے۔ اور ایک بدی دوسری بدی کو اور گناہ کو ساتھ لے آتی ہے۔

بنی اسرائیل کو عہد شکنی کی نقد سزا حسب ضابطہ ان کو یہ ملی کہ وہ رحمت خداوندی سے دور ہو گئے، جو سب سے بڑا وسیلۂ نجات ہے اور ان کے دل سخت ہو گئے جس کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ یعنی یہ لوگ کلام الٰہی کو اس کے ٹھکانے سے پھیر دیتے ہیں۔ یعنی خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں۔ کبھی اس کے الفاظ میں اور کبھی معنی میں، کبھی تلاوت میں۔ تحریف کی یہ سب اقسام قرآن کریم اور کتب حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔ جس کا قدرے اعتراف آجکل بعض یورپین عیسائیوں کو بھی کرنا پڑا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اس معنوی سزا کا یہ نتیجہ ہوا کہ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ۔ یعنی نصیحت جو ان کو کی گئی تھی کہ اس سے نفع اٹھانا بھول گئے۔ اور پھر فرمایا کہ ان کی یہ سزا ایسی ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ۔ یعنی آپ ہمیشہ ان کی کسی دغا فریب پر مطلع ہوتے رہیں گے۔ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ۔ بجز تھوڑے لوگوں کے جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ جو پہلے اہل کتاب کے دین پر تھے پھر سچے مسلمان ہو گئے۔

یہاں تک بنی اسرائیل کی بد اعمالیوں اور بد اخلاقیوں کا جو بیان آیا بظاہر اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے انتہائی نفرت اور حقارت کا معاملہ کریں، ان کو پاس نہ آنے دیں۔ اس لئے آیت کے آخری جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ یعنی آپ ان کو معاف کریں اور ان کی بدعملی سے درگذر کریں۔ ان سے منافرت کی صورت نہ رکھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایسے حالات کے

باوجود اپنے طبعی تقاضے پر عمل نہ کریں یعنی منافرت کا برتاؤ نہ کریں۔ کیونکہ ان کی سخت دلی اور بے حسی کے بعد اگرچہ کسی وعظ و پند کا اُن کے لیے مؤثر ہونا مستبعد ہے۔ لیکن رواداری اور حسنِ خلق کا معاملہ ایسا کیمیا ہے کہ اس کے ذریعہ ان بے حسوں میں بھی حس پیدا ہو سکتی ہے۔ اور ان میں حس پیدا ہو یا نہ ہو، بہرحال اپنے اخلاق و معاملات کو درست رکھنا تو ضروری ہے، احسان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ کا اور قرب حاصل ہو ہی جائے گا۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى۔ اس آیت سے پہلی آیت میں یہود کی عہد شکنی اور عذاب کا ذکر تھا، اس آیت میں کچھ نصاریٰ کا حال بیان فرمایا ہے۔

عیسائی فرقوں میں باہمی عداوت

اس آیت میں حق تعالیٰ نے عیسائیوں کی عہد شکنی کی یہ سزا بیان کی ہے کہ ان کے آپس میں افتراق اور بغض و عداوت ڈال دیا گیا جو قیامت تک چلتا رہے گا۔

اس پر آجکل کے عیسائیوں کے حالات سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ تو سب باہم متحد نظر آتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ حال ان لوگوں کا بیان کیا گیا ہے جو واقعی عیسائی ہیں۔ اور عیسائی مذہب کے پابند ہیں اور جو خود اپنے مذہب کو بھی چھوڑ کر دہریے بن گئے۔ وہ درحقیقت عیسائیوں کی فہرست سے خارج ہیں چاہے وہ قومی طور پر اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوں۔ ایسے لوگوں میں اگر وہ مذہبی افتراق اور باہمی عداوت نہ ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ کیونکہ افتراق و اختلاف تو مذہب کی بنیاد پر تھا، جب مذہب ہی نہ رہا تو اختلاف بھی نہ رہا اور آیت میں بیان اُن لوگوں کا ہے جو مذہباً نصاریٰ عیسائی ہیں ان کا اختلاف و افتراق مشہور و معروف ہے۔

حاشیہ بیضاوی میں تیسیر سے نقل کیا ہے کہ نصاریٰ میں اصل تین فرقے تھے، ایک نسطوریہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ دوسرا یعقوبیہ جو خود عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کے ساتھ متحد مانتے تھے۔ تیسرا ملکائیہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو تین خداؤں میں سے ایک مانتے تھے۔ اور

ظاہر ہے کہ اتنے بڑے اختلافِ عقائد کے ساتھ باہم عداوت ضروری ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ

اے کتاب والو تحقیق آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا ظاہر کرتا ہے تم پر بہت سی چیزیں

تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۭ قَدْ جَآءَكُمْ

جن کو تم چھپاتے تھے کتاب میں سے اور درگزر کرتا ہے بہت سی چیزوں سے بیشک تمہارے پاس

مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ

آیا ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی جس سے اللہ ہدایت کرتا ہے اس کو جو

اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ

تابع ہوا اس کی رضا کا سلامتی کی راہیں اور نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے

اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

روشنی میں اپنے حکم سے اور ان کو چلاتا ہے سیدھی راہ

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ

بیشک کافر ہوئے جنھوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ

تو کہدے پھر کس کا بس چل سکتا ہے اللہ کے آگے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کرے

الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ

مسیح مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو اور جتنے لوگ ہیں زمین میں سب کو

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ

اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ درمیان ان دونوں کے ہے پیدا

مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ

کرتا ہے جو چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور کہتے ہیں یہود

وَالنَّصٰرٰي نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ

اور نصاریٰ ہم بیٹے ہیں اللہ کے اور اس کے پیارے تو کہہ پھر کیوں عذاب کرتا

بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

ہے تم کو تمہارے گناہوں پر کوئی نہیں بلکہ تم بھی ایک آدمی ہو اسکی مخلوق میں بخشے جس کو چاہے اور

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

عذاب کرے جس کو چاہے اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ

بَيْنَهُمَا ۡ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

دونوں کے بیچ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

خُلاصۂ تفسیر

اے اہلِ کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) تمھارے پاس ہمارے یہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آئے ہیں (جن کے کمالِ علمی کا تو یہ حال ہے کہ کتاب (کے مضامین) سے جن چیزوں کو تم چھپا لیتے ہو، ان میں سے بہت سی باتوں کو (جن کے اظہار میں کوئی شرعی مصلحت مجھ ظاہراً تحصیل علوم نہ فرمانے کے باوجود خالص وحی کے ذریعہ واقف ہو کر) تمھارے سامنے صاف صاف کھول دیتے ہیں اور (کمالِ علمی و اخلاقی کا یہ عالم ہے کہ جن چیزوں کو تم نے چھپا لیا تھا ان میں سے) بہت سے امور کو (جاننے اور باخبر ہونے کے باوجود اخلاقاً ان کے اظہار سے) درگذر فرماتے ہیں (جبکہ ان کے اظہار میں کوئی شرعی مصلحت نہ ہو، صرف تمھاری رسوائی ہی ہوتی ہو۔ اور یہ کمالِ علمی دلیل نبوت ہے اور کمالِ اخلاقی اس کا مؤید اور مؤکد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرے معجزات کے علاوہ خود تمھارے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ آپ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور اسی رسول کے ذریعہ) تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے۔ اور (وہ) ایک کتاب واضح (ہے) کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں۔ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں (یعنی جنت میں جانے کے طریقے جو خاص عقائد و اعمال ہیں تعلیم فرماتے ہیں کیونکہ درحقیقت مکمل سلامتی تو جنت ہی میں ہو سکتی ہے کہ نہ اس میں کوئی کمی ہوتی ہے اور نہ زوال کا خطرہ) اور ان کو اپنی توفیق سے (کفر و معصیت کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و طاعت کے) نور کی طرف لے آتے ہیں۔ اور ان کو (ہمیشہ) راہِ راست پر قایم رکھتے ہیں۔ بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عین مسیح بن مریم ہے، آپ ان سے یوں پوچھئے کہ اگر ایسا ہے تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم (جن کو تم اللہ کا عین سمجھتے ہو) اور ان کی والدہ (حضرت مریم) کو اور جتنے زمین میں آباد ہیں، ان سب کو (موت سے) ہلاک کرنا چاہیں تو (کیا) کوئی شخص ایسا ہے کہ جو خدا تعالیٰ سے ذرا بھی ان کو بچا سکے۔ (یعنی اتنی بات تو تم بھی مانتے ہو کہ ان کو ہلاک کرنا اللہ کی قدرت میں ہے، تو جس ذات کا ہلاک کرنا دوسرے کے قبضہ میں ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے عقیدہ الوہیت مسیح کا باطل ہو گیا۔ اور (جو حقیقۃً خدا اور سچا معبود ہے یعنی) اللہ تعالیٰ (اس کی یہ شان ہے کہ اس) ہی کے لئے خاص ہے حکومت آسمانوں پر اور زمین پر اور جتنی چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں ان پر اور وہ جس چیز کو (جس طرح) چاہیں پیدا کر دیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔ اور یہود و نصاریٰ (دونوں فریق) جو یوں

کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔ (مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں ہماری ایک خصوصیت ہے کہ ہم گناہ بھی کریں تو اس پر اتنی ناراضی نہیں ہوتی جتنی دوسروں پر ہوتی ہے جیسے باپ کو اپنے بیٹے کی نافرمانی پر اتنا اثر نہیں ہوتا، جتنا کسی غیر آدمی کے ایسے ہی فعل پر ہوتا ہے۔ ان کے اس خیال باطل کے ابطال کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ) آپ (ان سے پوچھئے کہ اچھا پھر تم کو تمھارے گناہوں کے عوض (آخرت میں) عذاب کیوں دیں گے۔ (جس کے تم بھی قائل ہو جیسا کہ یہود کا قول تھا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔ یعنی اگر ہمیں عذاب جہنم ہوا بھی تو چند روز ہی ہوگا۔ اور خود حضرت مسیح علیہ السلام کا قول قرآن میں مذکور ہے۔ ..... اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ یعنی جس شخص نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دیتے ہیں۔ جو بوجہ التزام کے مثل اقرار نصاریٰ کے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کے عذاب کا جب تمھیں خود بھی اقرار ہے تو یہ بتلاؤ کہ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے یا محبوب کو عذاب بھی دیا کرتا ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو خدا کی اولاد کہنا باطل ہے یہاں یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات باپ بھی اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت کے لئے تادیباً سزا دیتا ہے تو سزا ہونا بیٹا ہونے کے منافی نہیں۔ کیونکہ باپ کی سزا تادیب کے لئے ہوئی ہے تاکہ وہ آئندہ ایسا کام نہ کرے۔ اور آخرت میں تادیب کا کوئی مقام نہیں کیونکہ وہ دار العمل نہیں دار الجزاء ہے۔ وہاں آگے کوئی کام کرنے، یا کسی کام سے روکنے کا کوئی احتمال نہیں۔ جس کو تادیب کہا جائے، اس لئے وہاں جو سزا ہوگی وہ خالص سزا اور تعذیب ہی ہو سکتی ہے۔ جو اولاد یا محبوب ہونے کے قطعاً منافی ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ تمھاری کوئی خصوصیت اللہ کے یہاں نہیں۔) بلکہ تم بھی منجملہ دوسری مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے بخشیں گے جس کو چاہیں گے سزا دیں گے اور اللہ ہی کی ہے سب حکومت آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ان میں بھی اور اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ (اس کے سوا کوئی پناہ نہیں)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں نصاریٰ کے ایک ہی قول کی تردید کی گئی ہے جو ان کے ایک

فرقہ کا عقیدہ ہے یعنی یہ کہ حضرت مسیح (معاذ اللہ) عین اللہ تعالیٰ ہیں۔ مگر تردید جس دلیل سے کی گئی ہے، وہ تمام فرقوں کے عقائد باطلہ پر عادی ہے جو بھی توحید کے خلاف ہیں، خواہ خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ، ہو یا تین خداؤں میں سے ایک خدا ہونے کا عقیدہ فاسدہ ہو۔ اس سے سب کا رد اور ابطال ہو گیا۔

اور اس جگہ حضرت مسیح اور ان کی والدہ کا ذکر فرمانے میں دو حکمتیں ہو سکتی ہیں اوّل تو یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا حق تعالیٰ کے سامنے یہ عجز کہ وہ اپنے آپ کو اللہ سے بچا سکتے ہیں نہ اپنی ماں کو جن کی خدمت و حفاظت کو شریف بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں اس فرقہ کے خیال کی بھی تردید ہو گئی، جو حضرت مریم کو تین خداؤں میں سے ایک خدا مانتے ہیں۔

اور اس جگہ حضرت مسیح اور مریم علیہما السلام کی موت کو بطور فرض کے ذکر فرمایا ہے، حالانکہ نزول قرآن کے وقت حضرت مریم کی موت محض فرضی نہیں تھی بلکہ واقع ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ یا تو تغلیب ہے۔ یعنی اصل میں موت عیسیٰ علیہ السلام کو بطور فرض کے بیان کرنا تھا، ماں کا ذکر بھی اسی عنوان کے ضمن میں کر دیا گیا اگرچہ ان کی موت واقع ہو چکی تھی۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جس طرح حضرت مریم پر ہم موت مسلط کر چکے ہیں، حضرت مسیح اور دوسری سب مخلوق پر بھی اسی طرح مسلط کر دینا ہمارے قبضہ میں ہے۔ اور یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ میں عیسائیوں کے اسی عقیدۂ باطلہ کے منشار کو باطل کرنا ہے۔ کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنانے کا اصل منشار ان کے یہاں یہ ہے کہ ان کی پیدائش ساری دنیا کے قاعدوں کے خلاف بغیر باپ کے صرف ماں سے ہوئی ہے۔ اگر وہ بھی انسان ہوتے تو قاعدہ کے مطابق ماں اور باپ دونوں کے ذریعہ پیدائش ہوتی۔

اس جملہ میں اس کا جواب دیدیا کہ اللہ تعالیٰ کو سب طرح قدرت کاملہ حاصل ہے کہ جو چاہے، جس طرح چاہے پیدا کر دے۔ جیسا کہ آیت :-

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ۔

میں اسی شبہ کا ازالہ فرمایا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تخلیق عام قانونِ قدرت سے الگ ہونا اُن کی خدائی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

دیکھو حضرت آدم علیہ السلام کو تو حق تعالیٰ نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا فرما دیا تھا۔ ان کو سب قدرت ہے وہی خالق و مالک اور لائق عبادت ہیں۔ دوسرا کوئی ان کا شریک نہیں ہو سکتا۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ

اے کتاب والو آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا کھولتا ہے تم پر

عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ

رسولوں کے انقطاع کے بعد کبھی تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس نہ آیا کوئی

بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ

خوشی یا ڈر سنانے والا سو آچکا تمہارے پاس خوشی اور ڈر سنانے والا

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے اہل کتاب تمہارے پاس یہ ہمارے رسول (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) آپہونچے جو کہ تم کو (شریعت کی باتیں) صاف صاف بتلاتے ہیں۔ ایسے وقت میں کہ رسولوں (کے آنے کا) سلسلہ (مدت سے) موقوف تھا (اور شرائع سابقہ مفقود اور گم ہو چکی تھیں اور انبیاء کا سلسلہ عرصہ دراز تک بند رہنے سے اُن گم شدہ شرائع کے دوبارہ دریافت ہونے کا امکان بھی نہ رہا تھا۔ اس لئے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت شدید تھی تو ایسے وقت آپ کا تشریف لانا بڑی نعمت اور غنیمت سمجھنا چاہیئے) تاکہ تم (قیامت میں) یوں نہ کہنے لگو (کہ دین کے معاملہ میں غلطی اور کوتاہی میں ہم اس لئے معذور ہیں کہ) ہمارے پاس (کوئی رسول جو کہ) بشیر اور نذیر (ہو جس سے ہم کو دین کا صحیح علم اور عمل پر اُبھار پیدا ہوتا) نہیں آیا سو (اب اس عذر کی گنجائش نہیں رہی کیونکہ) تمہارے پاس بشیر و نذیر (یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم) آچکے ہیں (اب نہ مانو تو اپنے انجام کو خود سمجھ لو) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (کہ جب چاہیں رحمت سے اپنے انبیاء بھیجدیں جب چاہیں حکمت سے ان کو روک لیں اسلئے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جب مدت دراز سے انبیاء کا سلسلہ بند ہے تو اب کوئی رسول نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ سلسلہ ایک مدت تک موقوف رکھنا حق تعالیٰ کی حکمت سے تھا، اس نے سلسلہ نبوت بند اور ختم کر دینے کا کوئی اعلان اس وقت تک نہیں کیا تھا۔ بلکہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ یہ خبریں بھی دیدی تھیں کہ آخر زمانے میں ایک خاص رسول خاص شان اور خاص صفات کے ساتھ آنے والے ہیں۔ جن پر نبوت کا اختتام ہوگا۔ اس اعلان کے مطابق خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ——

مَعارف ومَسائِل

عَلٰی فَتۡرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ ۔ فترت کے لفظی معنی سُست ہونے، ساکن ہونے اور کسی کام کو معطل اور بند کر دینے کے آتے ہیں۔ اس آیت میں ائمہ تفسیر نے فترت کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔ اور مراد اس سے کچھ عرصہ کے لئے سلسلۂ نبوت و انبیاء بند رہنا ہے جو حضرت عیسٰی کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک کا زمانہ ہے۔

زمانۂ فترت کی تحقیق

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا زمانہ ہے۔ اس تمام مدت میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں کبھی فترت نہیں ہوئی۔ صرف بنی اسرائیل میں سے ایک ہزار انبیاء اس عرصہ میں مبعوث ہوئے۔ اور غیر بنی اسرائیل میں سے جو انبیاء ہوئے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان صرف پانچسو سال کا عرصہ ہے۔ اس میں سلسلہ انبیاء بند رہا، اسی لئے اس زمانہ کو زمانۂ فترت کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی اتنا زمانہ انبیاء کی بعثت سے خالی نہیں رہا۔ (قرطبی مع ایضاح)

حضرت موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کی مدت، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کی مدت میں اور بھی مختلف روایات ہیں جن میں اس سے کم و بیش مدتیں بیان ہوئی ہیں، مگر اصل مقصد پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

امام بخاری رحؒ نے حضرت سلمان فارسی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ چھ سو سال کا تھا۔ اور اس پوری مدت میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کے حوالے سے مشکوٰۃ شریف میں حدیث آئی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا اَوۡلَی النَّاسِ بِعِیۡسٰی ۔ یعنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ قریب ہوں۔ اور اس کا مطلب آخر حدیث میں یہ بیان فرمایا، لَیۡسَ بَیۡنَنَا نَبِیٌّ یعنی ہم دونوں کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے۔

اور سورۂ یٰس میں جو تین رسولوں کا ذکر ہے وہ درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد تھے۔ جن کو لغوی معنے کے اعتبار سے رسول کہا گیا ہے۔

اور خالد بن سنان عربی کا جو بعض نے اس زمانۂ فترت میں ہونا بیان کیا ہے اس کے متعلق تفسیر روح المعانی میں بحوالہ شہاب بیان کیا ہے کہ ان کا نبی ہونا تو صحیح ہے مگر زمانہ اُن کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہے بعد میں نہیں۔

زمانۂ فترت کے احکام

آیت مذکورہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض کوئی قوم ایسی ہو کہ اُن کے پاس نہ کوئی رسول اور نہ کوئی پیغمبر آیا اور نہ اُن کے نائبین پہونچے، اور نہ پچھلے انبیاء کی شریعت ان کے پاس محفوظ تھی تو یہ لوگ اگر شرک کے علاوہ کسی غلط کاری اور گمراہی میں مبتلا ہو جاویں تو وہ معذور سمجھے جاویں گے۔ وہ مستحق عذاب نہیں ہوں گے۔ اسی لئے حضرات فقہاء کا اہل فترت کے معاملہ میں اختلاف ہے کہ وہ بخشے جاویں گے یا نہیں۔

جمہور کا رجحان یہ ہے کہ امید اسی کی ہے کہ وہ بخشدیے جاویں گے جبکہ وہ اپنے اس مذہب کے پابند رہے ہوں جو غلط سلط اُن کے پاس حضرت موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کی طرف منسوب ہو کر موجود تھا۔ بشرطیکہ وہ توحید کے مخالف اور شرک میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ مسئلہ توحید کسی نقل کا محتاج نہیں۔ وہ ہر انسان ذرا سا غور کرے تو اپنی ہی عقل سے معلوم کر سکتا ہے۔

ایک سَوال اور جَواب

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جن اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو اس آیت میں خطاب ہے، اُن کے لئے اگرچہ زمانہ فترت میں کوئی رسول نہیں پہونچا، مگر اُن کے پاس تورات اور انجیل تو موجود تھی۔ ان کے علماء بھی تھے تو پھر قیامت میں ان کے لئے یہ عذر کرنے کا کیا موقع تھا کہ ہمارے پاس کوئی ہدایت نہیں پہنچی تھی۔ جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک تورات و انجیل اصلی باقی نہیں رہی تھی۔ تحریفات ہو کر ان میں جھوٹے قصے کہانیاں داخل ہو گئی تھیں۔ اس لئے اُن کا وجود و عدم برابر تھا۔ اور اتفاق سے کہیں کوئی اصلی نسخہ کسی کے پاس گمنام جگہ میں محفوظ رہا بھی تو وہ اس کے منافی نہیں۔ جیسا کہ بعض علماء ابن تیمیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ تورات و انجیل کے اصلی نسخے کہیں کہیں موجود تھے۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص کمالات کی طرف اشارہ

اس آیت میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا کہ ہمارے رسول محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ایک طویل فترت کے بعد آئے ہیں۔ اس میں ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ تم لوگوں کو چاہیئے کہ آپ کے وجود کو غنیمت کبریٰ اور بڑی نعمت سمجھیں کیونکہ مدت دراز سے یہ سلسلہ بند